بلوچ قوم پرستی اور توانائی کی سیاست
رابرٹ جی ورسنگ
ترجمہ: محمد اختر
مشعل

بلوچ قوم پرستی اور توانائی کی سیاست

رابرٹ جی ورسنگ

ترجمہ: محمد اختر

مشعل

آر۔بی۔۵ سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

بلوچ قوم پرستی اور توانائی کی سیاست

رابرٹ جی ورسنگ

ترجمہ: محمد اختر

ناشر: مشعل بکس
آر۔بی۔۵' سیکنڈ فلور'
عوامی کمپلیکس' عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور۔54600' پاکستان
فون و فیکس 042-35866859
E-mail: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

فہرست

پیش لفظ

ملکی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ذرائع تلاش کرنا تقریباً تمام ممالک کی خارجہ پالیسی کے ایجنڈے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ توانائی پر انحصار کرنے والے تمام ممالک کے لیے توانائی پیدا کرنے والے ذرائع میں خودکفیل نہ ہونے کی وجہ سے ملکی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی توانائی پیدا کرنا ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ پاکستان جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے انہی ممالک میں سے ایک ہے۔ آیندہ کے لیے توانائی کے کافی ذرائع حاصل کرنے کے لیے اس کی حکومت کئی سطحوں پر کوششیں جاری رکھے ہوئے ہے۔ جس میں ملک کے اندر موجود توانائی کے ذرائع کا استعمال، ہمسایہ ملکوں کے ساتھ پائپ لائن بچھانے کے منصوبے پر بات چیت، اور گوادر پر ایک نئی بندرگاہ کی تعمیر شامل ہے جو ایک بہت بڑا منصوبہ ہے اور جو اگر مکمل ہو گیا تو اس کی بدولت پاکستان ایشیا میں تیل صاف کرنے اور اس کی تقسیم کے نئے نظام میں ایک اہم مقام حاصل کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر رابرٹ جی۔ ورسنگ اپنے مقالے ''بلوچ قوم پرستی اور توانائی کے وسائل کی جغرافیائی سیاست''میں واضح کرتے ہیں کہ پاکستان کی توانائی کے کافی ذرائع حاصل کرنے کی پالیسی پاکستان کے شمال مغربی صوبے بلوچستان میں جاری قبائلی علیحدگی پسند بغاوت سے متصادم ہے۔بلوچستان وہ مقام ہے جو اپنے توانائی کے ذرائع اور جغرافیے کے لحاظ سے پاکستان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اس بغاوت نے حکومت کو۔جس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ توانائی سے متعلق اپنے ایجنڈے کی تکمیل میں کسی چیز کو رکاوٹ نہیں بننے دے گی بلوچ قومیت پرستوں ۔جو چاہتے ہیں کہ بلوچستان کے مستقبل کے بارے میں فیصلوں میں ان کی رائے کو زیادہ اہمیت دی جائے کے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔

ڈاکٹر ورسنگ اپنے مفصل مقالے میں اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ اگر پاکستان کی حکومت اپنی توانائی کے ایجنڈے کی تکمیل چاہتی ہے تو اسے بلوچ مسئلے کے لئے کوئی کامیاب حل تلاش کرنا ہوگا۔

رابرٹ جی ورسنگ۔۔تعارف

رابرٹ جی ورسنگ ایشیا۔ پیسفک سنٹر فار سیکورٹی سٹڈیز، ہوائی میں پڑھاتے ہیں۔جنوبی ایشیا کی سیاسی حالات اور بین الاقوامی تعلقات کے شعبوں میں آپ مہارت رکھتے ہیں۔اس موضوع پر تحقیق کے سلسلے میں آپ جنوبی ایشیا کے چالیس سے زیادہ دورے کر چکے ہیں۔آپ آٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔یہ مقالہ جو اس کتاب کا حصہ ہے اپریل 2008 میں لکھا گیا تھا۔

بلوچ قوم پرستی اور توانائی کے وسائل کی جغرافیائی سیاست:

پاکستان میں علیحدگی پسندی کا بدلتا ہوا تناظر

خلاصہ

اس مضمون میں بلوچوں کی اس علیحدگی پسند بغاوت کا جائزہ لیا گیا ہے جس نے حالیہ برسوں کے دوران پاکستان کے وسیع وعریض صوبے بلوچستان میں سر اٹھایا ہے۔ مصنف قرار دیتا ہے کہ موجودہ بغاوت کئی اہم حوالوں سے 1970ء کی دہائی کی بغاوت سے مختلف ہے۔ اس میں پائے جانے والے بنیادی فرق میں ایک توانائی کے وسائل کی پیش رفت کے حوالے سے ہے جس کو بعض حلقوں کی جانب سے ''ایشیا کا مشرق وسطیٰ'' بھی کہا جا رہا ہے۔ مضمون خاص طور پر اس بات پر بحث کرتا ہے کہ کس طرح پاکستان میں توانائی کے حوالے سے بڑھتا ہوا عدم تحفظ ہے جو کہ بڑھتی ہوئی طلب اور اس کے ساتھ بڑھتی ہوئی قلت اور خطے میں توانائی کے حوالے سے تیز ہوتی

مسابقت کا نتیجہ ہے، جس نے بلوچستان کی معاشی اور سٹریٹجک اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی صوبے میں دوبارہ سر اٹھانے والی علیحدگی کی تحریک سے نمٹنے کی پاکستان کی کوششوں کو بھی مشکل بنا دیا ہے۔

توانائی کے تیزی سے بدلتے ہوئے تناظر نے باغیوں کے لیے مواقع پر طاقتور سہ جہتی اثرات مرتب کیے ہیں۔ اول تو یہ کہ اس نے بلوچستان اور بلوچ قوم پرستی کو ایک ایسی حیثیت سے نوازا ہے جو کہ مرکزی حکومت کی ترجیحات کی سطح کے اعتبار سے بہت بلندی پر پہنچ چکی ہے اور یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس کی وجہ سے حکومت اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے زیرو ٹالیرنس اور باغیوں کو بے رحمی سے کچلنے کے آپشن کو اپنانے کی خود کو اجازت دینے پر تیار پاتی ہے۔ دوئم یہ کہ اس سے بلوچ باغیوں کو پہلے کے مقابلے میں بلوچستان پر کنٹرول حاصل ہونے کی صورت میں اور ماضی کے مقابلے میں حکومت کے لیے بلوچ باغیوں سے لڑائی کی سیاسی اور معاشی قیمت بڑھانے کے حوالے سے کہیں زیادہ فائدہ بھی مل رہا ہے۔ سوئم یہ کہ (جو زیادہ امید افزا صورت حال ہے) بلوچستان کو انرجی کی ترسیل کے حوالے سے ایک اہم کوریڈور میں تبدیل کرنے کی صورت میں بدلتا ہوا تناظر بلوچ قوم پرستوں کے مطالبات کو مثبت اور پرامن طریقے سے پورا کرنے کے لیے اہم مواقع تشکیل دیتا ہے۔ اگرچہ اس نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہ بغاوت سے نمٹنے کے لیے حکومت نے جو حکمت عملی اپنا رکھی ہے وہ تا حال تاریک پہلوؤں کی حامل رہی ہے، مصنف کا اصرار ہے کہ توانائی کے حوالے سے بلوچستان کا تیزی سے بدلتا ہوا تناظر وہ وسائل اور مراعات دونوں فراہم کر سکتا ہے جس سے بلوچوں کی بغاوت کو ہموار اور صلح جوئی کے طریقے کے ساتھ اپنے انجام

تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ بلوچستان میں پاکستان کی مرکزی حکومت کی جانب سے طریقہ کار کو تبدیل کرنے اور بلوچ قوم پرستوں کو فوجی کے بجائے سیاسی طور پر مصروف کرنے کی تدبیر بھی کوئی آسان نہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ ایک فوجی طرز فکر ہی اس راہ میں رکاوٹ ہے بلکہ بلوچستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے کا عمل اس سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے۔

اس وقت توانائی سے متعلقہ خطرناک مسائل اور دیگر کئی سٹرٹیجک طاقتوں کی کشمکش سے یہ خطہ سامنا کر رہا ہے۔ 1970ء کی دہائی کی طرح اس مرتبہ بھی یہ صوبہ جنگ زدہ افغانستان کے سائے سے باہر نہیں نکل سکا جس کی وجہ سے اسلام آباد کو پالیسیوں کے حوالے سے لامحدود مسائل کا سامنا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار سایوں کا اضافہ ہو چکا ہے جو اسی طرح مشکلات پیدا کرنے والے ہیں۔ اس مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ بلوچستان کے حالات کی وجہ سے خاص طور پر اسلام آباد کے لیے اس حوالے سے پالیسی سازی میں کس قدر تحفظات درپیش ہیں۔ ان تحفظات میں نہ صرف اس کے اپنے توانائی کے ذرائع شامل ہیں بلکہ ایران اور ترکمانستان وغیرہ سے گیس کی مجوزہ درآمد اور چین کے اشتراک سے شمالی جنوبی تجارتی اور توانائی کے کوریڈور کا منصوبہ بھی شامل ہے۔ ایسا بہت غیر امکانی دکھائی دیتا ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ان تحفظات میں کسی قسم کی کمی ہوگی۔ نتیجتاً حکومت کو اس بات پر قائل کرنا کہ وہ بلوچ قبائلی اقلیت کے مطالبات کو بلند تر ترجیحات میں شامل کرے، بلاشبہ ایک مشکل امر ہوگا۔

تعارف

''ان افغانستانز شیڈو'' نامی مشہور مصنف سیلگ ایس ہیری سن کی 1981ء میں شائع ہونے والی کتاب میں اس زمانے میں روس کی طرف سے درپیش توسیع پسندی کے خطرے کو بلوچ علیحدگی پسندی کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ یہ بلوچستان (1) تھا جو پاکستان کا کم گنجان آباد وسیع وعریض جنوب مغربی صوبہ ہے جہاں پاکستانی فوج نے 1970ء کے عشرے میں قبائلیوں کی علیحدگی پسند بغاوت کو بے رحمی کے ساتھ کچل دیا تھا۔ شورش پسند صوبہ بلوچستان افغانستان اور سمندر کے درمیان میں واقع ہے۔ جب 1979ء میں سوویت یونین نے اپنی فوج کے ذریعے افغانستان پر قبضہ کرلیا تھا تو قدرتی طور پر اس بات کا امکان پیدا ہوگیا تھا کہ سوویت لیڈر بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک کی پشت پناہی کر کے اپنا گرم پانیوں تک پہنچنے کا دیرینہ خواب پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ سیلگ ہیری سن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ کس طرح سٹرٹیجک اہمیت کا حامل صوبہ بلوچستان اور وہاں پر رہنے والے پچاس لاکھ بلوچ سپر پاور کی

جنگ کے لیے آسانی کے ساتھ فوکل پوائنٹ بن سکتے ہیں۔

ہیری سن کی اس پیشگوئی کو لگ بھگ ایک چوتھائی صدی گذر چکی ہے۔ بلوچستان میں قوم پرستی ایک بار پھر اٹھ رہی ہے اور بلوچستان ایک بار پھر پاکستانی فورسز اور بلوچ عسکریت پسندوں کے درمیان متشدد ٹکراؤ کا مقام بن چکا ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اگر موجودہ بغاوت کا موازنہ 1970ء کی بغاوت سے کیا جائے تو اس میں تسلسل کا کافی سارا عنصر ملتا ہے۔ اس میں سب سے بنیادی چیز تو حکومت کا وہ مسلسل انکار کا رویہ ہے جو وہ بلوچ قوم پرستی کو قانونی حیثیت نہ دینے یا بلوچ قوم پرستوں کو کسی قسم کے سنجیدہ مذاکرات میں شامل نہ کرنے کی صورت میں اپنائے ہوئے ہیں۔ اس انکاری رویے میں وہ متوازی رجحان بھی شامل ہے جو بلوچستان میں اپنے مفادات کو زیادہ تر فوجی طریقے سے محفوظ رکھنے کے حوالے سے ہے۔

تاہم بلوچ بغاوت کے ضمن میں اس کی پہلی اور موجودہ لہر کے درمیان جو عدم تسلسل ہے وہ بھی کم قابل مشاہدہ نہیں۔ اس عدم تسلسل کی ایک وجہ تو اس تنازعے کے حوالے سے آج کا تناظر ہے جو اندرونی اور بیرونی دونوں صورتوں میں موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں بہت زیادہ تبدیلی آچکی ہے۔ سوویت یونین اب باقی نہیں رہا۔ سکڑتے ہوئے روس کے بارے میں مشہور اس کی گرم پانیوں تک رسائی کی خواہش اب بمشکل ہی قابل فہم نظر آتی ہے اور اس کا ذکر بھی شاذ و نادر ہوتا ہے۔ افغانستان میں سوویت فوج کی جگہ نیٹو کی فوج آچکی ہے اور اس مغربی فوج کے دشمن افغان ہیں اور ان میں زیادہ تر وہی لوگ شامل ہیں جو کسی زمانے میں ان کے

پرزور سوویت مخالف اتحادی تھے۔1970ء کے عشرے میں پاکستان بھارت کے ہاتھوں زبردست فوجی شکست کے سانحے سے بحال ہو رہا تھا۔اب یہ بھارت کے ساتھ ایک جامع مذاکراتی عمل شروع کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جس کا مقصد بنیادی طور پر بھارت کے ساتھ مستقل امن کا قیام ہے جس کے لیے اس نے حیران کن طور پر کشمیر میں کامیاب سیز فائر کر دیا جس کو 2007ء کے اواخر میں چار سال پورے ہو گئے۔1970ء کی دہائی میں بلوچ بغاوت کے جواب میں ذوالفقار علی بھٹو کی سویلین حکومت کی جانب سے بغاوت کو کچلنے کے لیے فوجی طاقت کا استعمال کیا گیا۔لڑائی کا اس وقت جو راؤنڈ چل رہا ہے اس میں بلوچ قوم پرست پرویز مشرف کی فوجی غلبے کی حامل حکومت جس نے 1999ء میں اقتدار پر قبضہ کیا تھا(4)، کے خلاف ہتھیار بند ہیں۔

اس وقت جو ٹکراؤ چل رہا ہے اس کے فریقین میں واضح طور پر بڑا ردوبدل اور کردار معکوس عمل میں آچکا ہے اور خطے میں اس وقت جو سیاسی اور تزویراتی تحریکات اعمال کو آگے بڑھا رہی ہیں وہ محض پچھلے دور کی نقل نہیں ہے۔بلوچ علیحدگی پسندی کے تناظر میں یہی تبدیلی ہے جس کو اس مضمون میں زیر غور لایا گیا ہے۔

آج جو تنازعہ ہے اس میں جو سب سے قابل ذکر تبدیلی ہے اور جو اس مضمون کا خاص فوکس ہے وہ انرجی کے وسائل کے تناظر میں ہے۔اندرونی اور بیرونی طور پر پاکستانی سیکیورٹی پالیسی کے ضمن میں ہائیڈروکاربن اور توانائی کے دیگر وسائل بشمول تیل اور قدرتی گیس تک محفوظ رسائی حالیہ چند عشروں کے دوران بنیادی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔یہ کہنا پڑے گا کہ دیگر ہمسایہ ممالک کی طرح پاکستان کے لیے بھی انرجی سیکورٹی

اس کی قومی ترجیحات میں صف اول میں آ چکی ہے(5)۔

بلوچستان میں جو تنازعہ چل رہا ہے اس میں توانائی کے ذرائع کی جو اہمیت ہے اس کا ایک اشارہ تو کئی عشروں پہلے سیلگ ہیری سن کی کتاب میں آ ہی چکا ہے جس میں وہ لکھتا ہے:

''اگر بلوچستان میں لڑائی اس صوبے کے جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت اور وہاں تیل، گیس، یورینیم اور توانائی کے ذرائع کی موجودگی کی وجہ سے نہیں لڑی جا رہی تھی تو پھر کس لیے لڑی جا رہی ہے جبکہ بلوچستان ایک بے آب و گیاہ، ویران اور ناقابل رہائش خطہ ہے؟۔(6)''

گذشتہ پانچ سال کے دوران بلوچ قوم پرستوں اور مرکزی حکومت کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے نتیجے میں ریاست مخالف تشدد کے واقعات میں تسلسل کے ساتھ اضافہ ہوا ہے جس کے دوران قابل ذکر ہدف صوبے میں موجود توانائی کے ذرائع کا انفراسٹرکچر اور سول و سیکورٹی ملازمین رہے ہیں۔ لہذا بلوچستان میں جاری بغاوت میں پاکستان کے انرجی کے ذرائع کا مخصوص کردار ہے۔ اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو تین صورتوں میں بلوچ قوم پرستی کا اس سے اہم تعلق ہے۔ اول تو بلوچستان کا صوبہ خود ہے جو کہ پاکستان کا سب سے بڑا اور سب سے کم آبادی والا اور چاروں صوبوں میں سب سے پسماندہ صوبہ ہے اور دوسری جانب توانائی کے ذرائع سے مالا مال ہے۔

بلوچ قوم پرستوں کی جانب سے جن شکایات کا اظہار مستقل طور پر اور تواتر سے کیا جاتا رہا ہے ان میں توانائی کے ان ذرائع کے حوالے سے بھی شکایات ہیں جن

میں کوئلہ اور گیس سرفہرست ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مرکزی حکومت صوبے کومناسب معاوضہ دیے بغیران سے فائدہ اٹھارہی ہے۔

دوئم اگرایران اور ترکمانستان سے قدرتی گیس کی سپلائی کے لیے پائپ لائن بچھائی جاتی ہے جس کے ذریعے پاکستان یاممکنہ طور پر بھارت کوگیس کی سپلائی دی جاتی ہے تو اس مقصد کے لیے بلوچستان کا راستہ استعمال کیا جائے گا۔اس منصوبے پرعمل درآمد کی راہ میں جورکاوٹیں حائل ہیں ان میں بلوچ قوم پرستوں کی جانب سے اس پائپ لائن پرحملوں کے خدشات بھی شامل ہیں جس کی صورت میں گیس کی سپلائی معطل ہوسکتی ہے۔

سوئم ، بلوچ قوم پرستوں کے لیے وہاں پرموجودتوانائی کے ذرائع ایک تیسری صورت میں جس طرح اہمیت کے حامل ہیں وہ یہ ہے کہ بلوچستان میں گوادر کی ساحلی پٹی کے مقام پرایک بڑی بندرگاہ اورتوانائی کے مرکز کی تعمیر کی جارہی ہے۔گوادر کے ذریعے ہی ٹرانسپورٹ کوریڈور کا ایک بین الریاستی جال بچھائے جانے کا منصوبہ ہے جس کے ذریعے پاکستان کوسڑک ، ریل ، فضا اورکسی حدتک پائپ لائن کے ذریعے چین کے صوبے سنکیانگ اور پھر براستہ افغانستان توانائی کی دولت سے مالا مال وسط ایشائی ریاستوں کے ساتھ منسلک کیا جارہا ہے۔بلوچ قوم پرستوں کی شکایت ہے کہ حکومت ان کے ساتھ مشورہ کیے بغیر بندرگاہ اورکوریڈورتعمیر کررہی ہے۔اس کے علاوہ اس میں نہ بلوچوں کوشریک کیا جارہا ہے اور نہ انہیں کسی قسم کا فائدہ پہنچائے جانے کا امکان ہے۔بلوچ قوم پرستوں کی جانب سے بعض اوقات چین کوبھی غصے کا نشانہ بنایا جاتا ہے کیونکہ گوادرمیں اس کی سرمایہ کاری اور دیگر بلوچستان سے متعلقہ منصوبوں میں

اس کی شراکت بہت اہمیت کی حامل ہے۔حالیہ برسوں کے دوران پاکستان میں بہت سے چینی شہریوں کو پانچ متشدد حملوں کا نشانہ بنایا جاچکا ہے۔ان میں سے تین حملے تو بلوچستان میں کیے گئے جن میں سے دو حملے بہت مہلک ثابت ہوئے (7)۔مزید براں اضافی حقائق یہ ہیں کہ بلوچستان میں گوادر میں بندرگاہ پاکستان کے ان بلندوبالا عزائم کی تکمیل کے لیے بنائی جارہی ہے جس کا مقصد پاکستان کوتوانائی کا بڑا ذریعہ بنانا اور بحیرہ عرب میں کمرشل تجارتی راستہ تشکیل دینا ہے جس کی وجہ سے بلوچوں کی شکایات میں ایک جیوسٹریٹیجک عنصر بھی شامل ہوجاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ توانائی کے حوالے سے بدلتا ہوا تناظر بغاوت اور جوابی بغاوت کے تزویراتی بہاؤ پر شدید اثرات مرتب کرتا ہے۔لیکن اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے اس مضمون میں جونکتہ اٹھایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ توانائی کے حوالے سے بدلتا ہوا تناظر بلوچ قوم پرستی پر بھی شدید سہ جہتی قسم کے اثرات مرتب کررہا ہے۔اول یہ کہ اس نے مرکزی حکومت کے لیے بلوچستان اور بلوچ قوم پرستی کی اہمیت میں بہت اضافہ کردیا ہے۔اس بڑھتی ہوئی اہمیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حکومت پر دباؤ بڑھتا جارہا ہے کہ بلوچستان میں بغاوت کو فوری اور حتمی طور پر ختم کرے،باغیوں کے مطالبات کے حوالے سے حکومت کسی قسم کی برداشت کا مظاہرہ نہ کرے اوراس مسئلے کو پوری طاقت کے ساتھ حل کیا جائے۔دوسرے یہ کہ توانائی کے حوالے سے بدلتے ہوئے تناظر کے باعث بلوچ باغی نہ صرف بلوچستان پر کنٹرول کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ مسلح ہوکرلڑرہے ہیں اوراس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ بغاوت کے لیے جوابی کارروائی کے سلسلے میں حکومت کے لیے معاشی اورسیاسی قیمت

پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔سوئم یہ کہ انرجی کے حوالے سے بدلتے ہوئے تناظر میں دونوں فریقوں کے لیے فائدہ ہے جس میں پاکستان کے محصولات میں بڑا اضافہ اور بلوچستان کی معیشت اور سماجی انفراسٹرکچر میں ڈرامائی بہتری شامل ہیں جبکہ اس میں وہ مواقع بھی ہیں جن کے ذریعے بلوچ قوم پرستوں کے مطالبات کو مثبت اور باہمی طور پر قابل قبول انداز میں پورا کیا جا سکتا ہے۔لہذا اگرچہ بغاوت کے بغیر کسی دورائے کے تاریک پہلو ہیں لیکن توانائی کے حوالے سے تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے تناظر میں یہ مذاکراتی عمل اور مناسب طریقے سے بغاوت کو ختم کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

اس مضمون کا آغاز توانائی اور بغاوت کے درمیان تعلق کے قریبی جائزے کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے۔

توانائی کی جیو پولیٹکس

اول: بلوچستان کے ذرائع توانائی

بلوچستان میں کوئلے اور قدرتی گیس کے قابل ذکر ذخائر موجود ہیں اور اس بات کی قیاس آرائی بھی کی جاتی ہے کہ بلوچستان میں پٹرولم کے بھی وسیع ذخائر موجود ہیں۔فی الحال تو پاکستان میں توانائی کے حوالے سے بلوچستان کی گیس بہت اہمیت کی حامل ہے۔اس کی اہمیت کی تین وجوہات ہیں۔اول یہ کہ پاکستان میں خرچ کی جانے والی توانائی میں قدرتی گیس کا حصہ پچاس فیصد ہے جو کہ اس وقت پاکستان میں توانائی کا بنیادی ذریعہ ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان کی معیشت دنیا میں سب سے زیادہ گیس پر انحصار کرنے والی معیشت ہے۔دوئم یہ کہ پاکستان میں اس وقت جو گیس کے ثابت شدہ ذخائر ہیں وہ 2006ء کے اعداد وشمار کے مطابق اٹھائیس ٹریلین کیوبک فٹ ہیں جن میں سے انیس ٹریلین کیوبک فٹ یعنی اڑسٹھ فیصد بلوچستان میں ہیں۔سوئم یہ کہ بلوچستان پاکستان کی 36 سے 45 فیصد گیس پیدا کرتا ہے لیکن بلوچستان

میں جو گیس استعمال کی جاتی ہے وہ صرف سترہ فیصد ہے(8)۔خاص طور پر اہم بات یہ ہے کہ بلوچستان میں جو گیس پیدا کی جاتی ہے اس کا زیادہ تر حصہ طویل عرصے سے چلائی جانے والی سوئی گیس فیلڈ سے آتا ہے جو کہ ایک ایسا علاقہ ہے جو بگٹی قبیلے کا ہے اور بلوچوں کی بغاوت سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا علاقہ ہے۔

قدرتی گیس کی صنعت کو بند کر دینے یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کے حوالے سے بلوچ قوم پرست عسکریت پسندوں کی جو صلاحیت ہے وہ قابل ذکر ہے جو کہ محض ایک شور شرابا نہیں بلکہ حقیقی خطرہ ہے۔ریاست کی ملکیت میں موجود سوئی سدرن گیس کمپنی کی ملکیت میں ہی جو ڈسٹری بیوشن پائپ لائن ہے اس کی لمبائی 27542 کلومیٹر ہے جو دو صوبوں بلوچستان اور سندھ تک پھیلی ہوئی ہے اور اپنی اس طوالت کی وجہ سے اس کی مسلسل نگرانی اور حفاظت ایک بڑا مشکل کام ہے(9)۔واشنگٹن میں واقع جیمز ٹاؤن فاؤنڈیشن کے لیے مرتب کردہ مصنفین کی رپورٹ کے مطابق 2002ء میں بغاوت کا عمل تیز ہونے کے بعد عسکریت پسندوں کے حملے اور تشدد کے واقعات بالعموم اور گیس کی تنصیبات اور پائپ لائن پر حملوں کے واقعات بالخصوص عام ہو چکے ہیں اور ان کی تعداد میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے۔جنوری 2006ء میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق بلوچستان کے مختلف علاقوں میں اب تک حملوں اور تشدد کے 843 واقعات ہو چکے ہیں جن میں قانون نافذ کرنے والے اداروں پر حملوں کے 54 واقعات،گیس پائپ لائن پر حملوں کے 31 واقعات،مختلف اہداف پر راکٹ حملوں کے 417 واقعات، بارودی سرنگ حملوں کے 291 واقعات،مری قبائل کے مرکز ضلع کوہلو کے علاقے میں تشدد کے 166 واقعات بشمول 45 بم دھماکوں اور

110 راکٹ حملوں کے واقعات ہو چکے ہیں(10)۔

اسی ادارے کی ایک اور رپورٹ کے مطابق جو مئی 2006 کے اواخر میں پیش کی گئی اسکے مطابق تشدد کی شدت اور تسلسل میں بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ باغیوں کے حملوں کے پسندیدہ اہداف میں توانائی کی پیداوار کی تنصیبات کے علاقے جیسے سوئی اور ڈیرہ بگٹی اور توانائی کا انفراسٹرکچر جس میں قدرتی گیس کی سپلائی کرنے والی پائپ لائن بھی شامل ہے جو پنجاب اور کراچی کے صنعتی اور گھریلو ضرورت کے لیے گیس سپلائی کرتی ہے۔19 مئی کو پنجاب کو جانے والی دو مرکزی گیس پائپ لائنوں کو اڑادیا گیا جس کے نتیجے میں صوبے کو گیس کی سپلائی کم ہوگئی۔اگرچہ طویل فاصلے کے درمیان پھیلی ہوئی گیس پائپ لائنوں کو اڑانا آسان ہے لیکن باغی اب گیس کی پیدوار کی تنصیبات جیسے مشکل اہداف بھی نشانہ بنانے لگے ہیں(11)۔

بلوچستان کے قوم پرستوں کے نزدیک پاکستان میں مقامی گیس انڈسٹری کی لگ بھگ پچاس سالہ تاریخ صوبے کی مقامی قبائلی آبادی کے لیے عدم مساوات کا مظہر ہے۔مثال کے طور پر اگر ملازمتوں کے حوالے سے بات کی جائے تو گیس انڈسٹری کے تقریباً اکثر پرکشش تنخواہوں اور مراعات پر کام کرنے والے افسر اور ماہرین کو بلوچستان کے باہر سے لیا جاتا ہے جبکہ مقامی بلوچوں کو معمولی نوعیت کی دیہاڑی دار ملازمتوں پر رکھا جاتا ہے(12)۔ظاہر ہے کہ اس کا علاج یہی ہے کہ گیس انڈسٹری کے بلوچ تکنیک کاروں اور ماہرین کی کمی کو پورا کرنے کے لیے سرکاری اخراجات پر بلوچستان میں تکنیکی تربیت کے لیے ادارے قائم کیے جائیں لیکن ان اقدام کو حالیہ دنوں سے پہلے کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔

اس طرح بلوچ قوم پرست ایک اور جس چیز پر شدید عدم اطمینان ظاہر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ گیس کی فروخت سے حاصل ہونے والے محصولات میں سے بلوچستان کو بہت کم حصہ دیا جاتا ہے۔اب جبکہ صورتحال ارتقاء پذیر ہوچکی ہے تو صوبے کی گیس کے وسائل کی ملکیت کے مطابق مالیاتی طور پر اس کی حصہ داری کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ بلوچستان پاکستان کا پہلا صوبہ ہے جہاں قدرتی گیس دریافت کی گئی ۔مرکزی حکومت کی جانب سے صوبے کو گیس کے لیے جو رائلٹی دی جاتی ہے وہ گیس کے کنوؤں سے گیس نکالے جانے کے اخراجات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ چونکہ پنجاب اور سندھ کے مقابلے میں بلوچستان سے گیس بہت پہلے دریافت ہوگئی تھی اس لیے بلوچستان میں اس کے نکالے جانے پر اخراجات بقیہ دونوں صوبوں کے مقابلے میں بہت پہلے ہی مستحکم اور کم ہوچکے ہیں۔لیکن اس کے بدلے میں اسے یہ صلہ مل رہا ہے کہ بلوچستان کو اوسطاً دیگر صوبوں کی طرح رائلٹی کی مد میں صرف بیس فیصد حصہ دیا جاتا ہے جو کہ ایک ایسا مالیاتی انتظام ہے جس نے بلوچستان کو جو ملک کا غریب ترین لیکن سب سے زیادہ گیس پیدا کرنے والا صوبہ ہے اس کو امیر صوبوں کے لیے سبسڈی فراہم کرنے والا صوبہ بنادیا ہے(13)۔قوم پرست یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ تاریخی طور پر مرکزی حکومت گیس کی بے پناہ آمدنی سے جو کچھ کماتی ہے اس میں سے بہت معمولی حصہ بلوچستان میں ترقیاتی اخراجات کی صورت میں صوبے کو دیا جاتا ہے(14)۔اس حوالے سے اس مضمون میں آگے چل کر بات کی جائے گی کہ قوم پرستوں کا یہ اعتراض کسی شک وشبے کے بغیر درست ہے۔

پاکستان میں اس وقت سالانہ ایک ٹریلین کیوبک فٹ گیس خرچ کی جارہی

ہے اور اس خرچ کی رفتار اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ گیس کے موجودہ ذخائر کم ہونے لگے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ درآمد شدہ گیس کی سپلائی پر انحصار بڑھنے کے علاوہ صنعتی، تجارتی اور گھریلوں استعمال کے باعث پاکستان کے موجود قدرتی ذخائر پر دباؤ بڑھتا رہے گا۔ کچھ دباؤ کو اس طرح بھی کام کیا جاتا ہے کہ ملک بھر میں پوری شدت کے ساتھ گیس کے نئے ذخائر تلاش کیے جائیں۔ لیکن اگر عسکریت پسندوں کی جانب سے حملے جاری رہتے ہیں تو امید کی یہ صورت بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ عسکریت پسندوں کو طاقت کے ذریعے کچل دیا جائے یا پھر ان کے ساتھ کسی قسم کی سیاسی سودے بازی کی جائے۔ اس حقیقت سے پتہ چلتا ہے کہ مقامی گیس سپلائی جب تک چلتی رہتی ہے یہ اسلام آباد اور بلوچ قوم پرستوں کے درمیان شدید تنازعے کا باعث بنی رہے گی۔

توانائی کی جیو پولیٹکس

دوئم: گیس کی پائپ لائنیں (15)

بیرون ممالک سے پاکستان اور بھارت کے لیے قدرتی گیس کی بذریعہ پائپ لائنوں کے درآمد کے بارے میں ان دنوں شدت سے غور کیا جا رہا ہے۔ان میں ایک پائپ لائن کی لمبائی 2700 کلومیٹر ہے جو کہ ایران پاکستان اور بھارت کے درمیان ہوگی جس کے ذریعے ایران کے وسیع جنوبی پارس کے آف شور ذخائر سے روزانہ 2.8 بلین کیوبک گیس پاکستان اور بھارت میں درآمد کی جاسکے گی۔اس منصوبے کے آغاز میں اس کے اخراجات کی مالیت چار بلین ڈالر تھی جو کہ اب بڑھ کر سات سے نو ارب بلین ڈالر ہو چکے ہیں اور ان پر 1990ء یک دہائی سے بات کی جا رہی ہے۔گیس پائپ لائن کا دوسرا مجوزہ منصوبہ ترکمانستان، افغانستان، پاکستان اور بھارت کے درمیان ہے جس کی طوالت 1680 کلومیٹر ہے جس پر اس وقت جو اخراجات کا تخمینہ ہے وہ 3.3 ارب ڈالر اور دس ارب ڈالر کے درمیان ہے۔اس پائپ لائن کے ذریعے روزانہ 3.2 بلین کیوبک فٹ گیس ترکمانستان کے دولت آباد کے

ذخائر سے بذریعہ افغانستان سے پاکستان اور بھارت کو درآمد کی جاسکے گی۔ گیس کی درآمد کے دونوں ذرائع پر تاحال کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا لیکن اہم بات یہ ہے کہ دونوں پائپ لائنیں بلوچستان سے ہی گذریں گی۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ سہ ملکی گیس پائپ لائن کے ایران پاکستان اور بھارت کے منصوبے جس نے پاکستان اور بھارت کے درمیان امن مذاکرات کے بعد 2004ء میں زور پکڑا تھا کے ذریعے اس منصوبے میں شامل تینوں ملکوں کو زبردست فائدہ ہوگا۔ ایران کو اس لیے فائدہ ہوگا کہ امریکی معاشی پابندیوں کی وجہ سے اسے جن مشکلات کا سامنا ہے اس سے نکلنے میں مدد ملے گی جبکہ پاکستان اور بھارت کو اس لیے فائدہ ہوگا کیونکہ ان کے ہاں گیس کے ذخائر طلب کے مقابلے میں تیزی سے کم ہورہے ہیں (16)۔ اگرچہ منصوبے میں شریک تینوں ممالک گذشتہ کئی سال کے دوران اس بات کے مثبت اشارے دیتے رہے ہیں کہ وہ منصوبے پر عمل درامد کے لیے پوری طرح پر عزم ہیں لیکن اس میں موجود رکاوٹیں بھی صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ اور حالیہ دنوں میں اس بات کے اشارے ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ منصوبے عملی شکل شاید نہ اختیار کرسکیں۔

ان میں سے ایک رکاوٹ بڑھتے ہوئے اخراجات ہیں۔ دوسری رکاوٹ اس کی وہ قیمت ہے جو بھارت کو ادا کرنے پڑے گی جب گیس کی پائپ لائن اس کی سرحد کراس کرے گی کہ اس کے لیے نہ صرف اسکو پاکستان کو کسٹم اور ٹرانزٹ فیس کی مد میں بھاری رقم دینی پڑے گی۔ تاہم اس سلسلے میں جو زیادہ بڑی قیمت اسے ادا کرنی پڑے گی وہ خلیج بنگال میں واقع اس کے کرشنا گوداوری کے قدرتی گیس کے ذخائر کے

حوالے سے ہے(17)۔قیمتوں کے حوالے سے جو رکاوٹ پیدا ہوئی تھی وہ اس وقت دور ہونے کی امید پیدا ہوئی تھی جب کم سے کم قیمت رکھنے کے حوالے سے فارمولے پر مفاہمت ہوئی تھی(18)۔تاہم 2007ء میں ایرانی حکومت کی جانب سے اپنے وزیر تیل کاظم وزیری ہامانی کی اچانک برطرفی کے نتیجے میں یہ رکاوٹ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہوگئی۔ہامانی جو سہ ملکی گیس پائپ لائن منصوبے کے معماروں میں شامل تھے انہیں اس لیے برطرف کیا گیا کیونکہ انہوں نے پاکستان اور بھارت کو گیس کی سپلائی کے لیے قیمتوں کے جس فارمولے پر اتفاق کیا تھا اس میں دونوں ملکوں کو ناقابل قبول حد تک تیس فیصد رعایت دی جا رہی تھی۔اس کے علاوہ ایک سبب یہ افواہیں بھی ہیں کہ وہ ایران پاکستان کی جانب سے ایرانی بلوچستان میں سرگرمیوں کے ضمن میں امریکہ کی خفیہ طور پر مدد کر رہا تھا جس کی وجہ سے ایرانی حکومت ناراض تھی۔اس کے علاوہ اس قسم کی ناقابل تردید قیاس آرائیاں بھی موجود تھیں کہ وہ پائپ لائن پراجیکٹ جس کے ذریعے ایرانی حکام کے دعوے کے مطابق 2011ء کے اوائل میں گیس سپلائی شروع کی جاسکتی تھی وہ بھی ایرانی وزیر تیل کی برطرفی کے ساتھ ہی ختم ہوگیا(19)۔

امریکہ کی جانب سے ایرانی پائپ لائن منصوبے کی شدید مخالفت اور ایران کے خلاف پابندیاں عائد کرنے کی دھمکیوں کے باعث یہ رکاوٹ اور بھی سخت ہوچکی ہے(20)۔خطے میں ایرانی عزائم اور اس کے مبینہ ایٹمی پروگرام کے باعث ناراض بش انتظامیہ کی جانب سے پاکستان اور بھارت دونوں پر مسلسل اور کئی سال تک دباؤ ایک ایسی چیز ہے جسے دونوں ملکوں کی طرف سے نظرانداز کرنا بہت مشکل ہے۔مارچ 2004ء میں پاکستان کو نان نیٹو اتحادی قرار دینے کے بعد امریکہ پاکستان کو دہشت

گردی کے خلاف جنگ کی مد میں اربوں ڈالر کی امداد دے چکا ہے۔ جبکہ دوسری جانب بھارت 2005ء میں امریکہ کے ساتھ سویلین ایٹمی معاہدے جس کو وہ بہت اہم سمجھتا ہے، کو کسی قسم کے خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ جولائی 2007ء میں اس معاہدے پر عمل درآمد کے ضمن میں ایک اہم قدم اٹھایا گیا جب دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت بھارت کو امریکہ کے ایٹمی ایندھن اور آلات تک رسائی دی گئی (21)۔ تاہم اس معاہدے کو تاحال امریکی کانگرس کی جانب سے حتمی منظوری دیے جانا باقی ہے۔ بھارت کی طرف سے دوبارہ ایرانی گیس پائپ لائن منصوبے کی طرف قدم بڑھانے سے روکنے کے لیے امریکی وزیر توانائی سیموئل بوڈمین کو مارچ 2007ء میں بھارت بھیجا گیا اور سختی کے ساتھ عوامی سطح پر یہ پیغام دیا گیا کہ اگر ایران کے ساتھ پائپ لائن منصوبے کو آگے بڑھایا گیا تو اس سے ایران کو ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری میں مدد ملے گی۔ لہٰذا انہوں نے واضح کیا کہ بھارت کو اس کام کو روکنا ہوگا (22)۔

ان تمام رکاوٹوں کے علاوہ ایک بڑی رکاوٹ بھارت کا وہ گہرا عدم اعتماد ہے جو بہت سے بھارتی پاکستان کے لیے رکھتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب بھارت کی انرجی سیکورٹی کا نازک مسئلہ ہو۔ بلاشبہ یہ بنیادی عدم اعتماد پاکستان کی اندرونی عدم استحکام کی صورت حال، بشمول بلوچستان میں بغاوت قابو سے باہر ہونے کے ممکنہ خطرات کی وجہ سے اور بھی بڑھ چکا ہے۔ ایران پاکستان اور بھارت کے درمیان وسیع وعریض گیس پائپ لائن لازمی بات ہے کہ باغیوں کے لیے ایک آسان ہدف ہوگی جو کہ وسیع وعریض بلوچستان میں 760 کلومیٹر کی طوالت (یعنی کل طوالت کا 28

فیصد) پر محیط ہوگی (23)۔الیکٹرانک مانیٹرنگ کے ذریعے پائپ لائن کو خطرے کو کم کیا جاسکتا ہے جبکہ پائپ کو نقصان کو بھی چند گھنٹوں سے لیکر چند دنوں میں مرمت کیا جاسکتا ہے(24)۔تاہم زیادہ تر مبصرین کے مطابق مجوزہ طوالت کی مذکورہ پائپ لائنیں باغیوں کا آسان ٹارگٹ ہوں گی اوران کا دفاع مشکل ہوگا اوران پر حملوں کے نتیجے میں معاشی طور پر شدید نقصان سامنے آئے گا۔بلوچ عسکریت پسند جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا توانائی کے انفراسٹرکچر پر زیادہ حملے کرنا شروع ہوگئے ہیں۔اس قسم کے واقعات سے چاہے نقصان بہت کم ہو تب بھی اس سے سرمایہ کاروں کا توانائی کے منصوبوں میں سرمایہ کاری کے حوالے سے اعتماد مجروح ہوتا ہے جو کہ پاکستان کی معاشی سٹرٹیجی کے حوالے سے ایک انتہائی اہم ہدف ہے(25)۔

جہاں تک چار ملکی یعنی ترکمانستان ، افغانستان ، پاکستان انڈیا پائپ لائن پراجیکٹ ہے جس کی امریکہ بھی حمایت کرتا ہے اس میں حائل رکاوٹیں اور بھی زیادہ بدترین ہیں۔چار ملکوں کے درمیان اس منصوبے کے حوالے سے مذاکرات میں جو مشکلات درپیش ہوسکتی ہیں ان کو اگر ایک طرف رکھ دیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اس منصوبے میں شامل دو فریق یعنی پاکستان اورافغانستان ایک سیکورٹی چیلنج پیش کرتے ہیں جو کہ پائپ لائن کا اہم راستہ ہیں یعنی بارہ سو کلومیٹر پائپ لائن جو ٹوٹل لمبائی کا اڑتیس فیصد بنتی ہے اسے افغانستان اور پاکستان سے ہی گذرنا ہے جو بعض مبصرین کے مطابق ایک ناقابل قبول قسم کی صورت حال ہے(26)۔افغانستان کے بڑے حصے میں جس طرح آج کل لڑائی ہورہی ہے اور پاکستان کے بلوچستان میں جس طرح عسکریت پسندوں کی جانب سے احتجاج اور تشدد کا عمل جاری ہے اس کو دیکھتے ہوئے

تو فی الحال اس چار ملکی پائپ لائن منصوبے کو قطعی قابل عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ امریکہ بھارت سے واضح الفاظ میں یہ کہہ چکا ہے وہ اسے ایران پاکستان بھارت یعنی سہ ملکی پائپ لائن پراجیکٹ کو چھوڑ کر چار ملکی منصوبے کو اپنانا چاہیے۔ فی الحال یہ نظر آتا ہے کہ بھارت کو بھی اس میں کوئی کشش دکھائی نہیں دیتی۔ اصل میں بھارت بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنے ملک کی انرجی سیکورٹی امریکہ کے ہاتھوں میں دے دے جو کہ چار ملکی منصوبے کی صورت میں ہے جس کو امریکی غلبے کے حامی افغانستان سے گذرنا ہے اور پھر پاکستان سے گذر کر بھارت پہنچنا ہے۔ اگست 2007ء میں پاکستانی حکومت کی جانب سے یہ حیران کن اعلان کہ وہ امریکہ کی انٹرنیشنل آئل کمپنی کو دس ارب ڈالر کا ٹھیکہ دے رہا ہے کہ وہ ترکمانستان سے افغانستان کے راستے پاکستان کے لیے تیل اور گیس کی پائپ لائن تعمیر کرے اور پھر اس کو بلوچستان میں گوادر تک لے جائے۔ اس اعلان سے پائپ لائن کے اس منصوبے میں جان پڑتی دکھائی دی ماسوائے یہ کہ اس میں بھارت شریک نہ تھا۔ تاہم سہ ملکی یا چار ملکی گیس پائپ لائن منصوبہ گذشتہ ایک عشرے سے زائد عرصے کے دوران وقفے وقفے سے بحال ہوتا رہا تاہم عملی طور پر کوئی صورت نہ بن سکی اور حکومت کی جانب سے اعلان کر دیا گیا کہ نئے منصوبے کو تین سال کے اندر مکمل کیا جائے گا جس میں قابل ذکر حد تک ساکھ کی کمی تھی (27)۔

مذکورہ گیس پائپ لائن منصوبوں کے مستقبل قریب میں حقیقت کا روپ دھارنے کے کمزور امکانات کے یقینی طور پر بلوچستان اور بلوچ قوم پرستی پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ اول تو یہ کہ اس طرح ترقی کے لیے ترسے ہوئے بلوچستان کو پائپ لائن گذرنے سے جو فائدہ ہونے کی امید ہوگی وہ ختم ہو جائے گی۔ اس فوائد میں تعمیر

اور دیکھ بھال کے ملازمتوں کے مواقع یا گیس ٹرانزٹ فیس میں صوبے کو حصہ ملنے کا امکان یا صوبے میں بڑے پیمانے پر گیس کی تقسیم شامل ہے۔اس کے علاوہ دوسرا منفی اثر جو بلوچستان پر پڑے گا وہ یہ ہوگا کہ جب باغی بلوچستان کے انرجی کے انفراسٹرکچر پر حملہ کریں گے تو پاکستان کے عوام میں تاثر پیدا ہوگا کہ ملک میں جو توانائی کا بڑھتا ہوا بحران ہے اس کی وجہ بلوچ عسکریت پسند ہیں کیونکہ یہ ایک ایسا بحران ہے جس سے عام پاکستانیوں کی روزمرہ زندگی بری طرح متاثر ہورہی ہے اور خرابی میں ہر گذرنے دن کے ساتھ اضافہ ہورہا ہے(28)۔ پاکستان میں توانائی کی قلت سے مزاج برہم ہونا یقینی ہے باالفاظ دیگر اس سے نسلی برداشت میں کمی ہوگی۔اس سے فرق نہیں پڑتا کہ بلوچ باغیوں کی جانب سے اب تک جو ہتھکنڈے استعمال کیے گئے ہیں اس سے بہت کم یا فوری طور پر مرمت ہوجانے والا نقصان ہی ہوا ہے تاہم اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باغیوں کی یہ صلاحیت کہاں تک جائے گی۔ایک اور چیز جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ باغیوں کے ان ہتھکنڈوں سے بلوچ کاز کے عام لوگوں کے دل جیتنے کے بجائے حکومت کے بلوچوں کے بارے میں پیدا کردہ اس تاثر کو ہی تقویت ملے گی کہ وہ پاکستان کی معاشی ترقی اور جدت کے دشمن ہیں۔

توانائی کی جیو پولیٹکس
سوئم: گوادر اور وسطی ایشیا ٹرانسپورٹ کوریڈور

مشرق کی طرف قدرتی گیس لائن کی پائپ لائن کی تعمیر کے خراب آغاز کی جگہ جس منصوبے نے لی ہے وہ تیزی سے پیش رفت کی بڑھنا اور سیاسی طور پر فیصلہ کن ٹرانسپورٹ کوریڈور ہے جو شمالی جنوبی تکون کی طرف تعمیر کی جا رہی ہے۔اس کوریڈور میں جو منصوبے شامل ہیں ان میں بندرگاہ، سڑکوں، ریل اور فضائی سفر کے انفراسٹرکچر نیٹ ورک کی تعمیر ہے۔اس نیٹ ورک کا بنیادی مقصد یہ ہوگا کہ تجارتی اور سیاسی تعلقات میں پیش رفت کے ساتھ ساتھ بھارت اور پاکستان کی انرجی کے وسائل سے مالا مال وسط ایشیائی ریاستوں کی طرف رسائی کو ممکن بنایا جا سکے اور ساتھ ہی توانائی کے وسائل کی پروڈکشن، پراسیسنگ اور ڈسٹری بیوشن پر بھی کچھ اثر ونفوز حاصل کیا جائے۔ مارچ 2007ء میں چین کے تعاون سے بلوچستان کے ساحل پر تعمیر ہونے والی گوادر ڈیپ سی پورٹ سے پاکستان کے ان ارادوں کی واضح طور پر عکاسی ہوتی ہے جو وہ وسط ایشیائی ریاستوں کے لیے تجارتی اور توانائی کے حوالے سے وسیلہ کار بننے کے لیے

رکھتا ہے۔اس طرح جنوب مغربی افغانستان میں زارنج دل آرام ہائی وے کی تعمیر سے بھارت کے بھی اسی قسم کے ارادوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

پاکستان کے سابق صدر مشرف نے چین کے وزیر اطلاعات لی شن کے ساتھ گوادر پورٹ کا افتتاح کیا۔مشرف نے بندرگاہ کی تعمیر کے حوالے سے خطاب کرتے ہوئے پاک چین دوستی کی تعریف کی۔انہوں نے اس نئی بندرگاہ کی تعمیر کی اس مخفی صلاحیت پر بھی بات کی جو یہ وسطی ایشیا، چین اور ترکمانستان کے لیے ایک مرکزی تجارتی کوریڈور کھولنے کی صورت میں رکھتی تھی۔خطاب میں انہوں نے بلوچستان کے ''انتہا پسند عناصر'' کو سختی سے وارننگ دی کہ وہ اپنے ہتھیار ڈال دیں بصورت دیگر ان کا بلوچستان سے صفایا کر دیا جائے گا۔گوادر جو مچھیروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں 2001ء میں بندرگاہ کا منصوبہ شروع ہونے سے پہلے تک لگ بھگ پچاس ہزار نفوس آباد تھے اب یہی گوادر سوا لاکھ کی آبادی پر مشتمل بڑا قصبہ بن چکا ہے جو جائیدادوں کے کاروبار میں آنے والے عروج کی صورت میں مزید توسیع اختیار کرنے والا ہے۔کراچی سے ساڑھے چھ سو کلو میٹر مغرب میں واقع گوادر پورٹ پاکستان کی چھوٹی سی بحریہ کے لیے بھی ایک قسم کی سٹرٹیجک گہرائی کی حامل ہے کیونکہ ماضی میں اسے بھارت کی کہیں بڑی بحریہ کے ہاتھوں جنگ کی صورت میں بلاک کیے جانے کا خطرہ تھا۔تاہم پاکستان کو گوادر پورٹ سے حاصل ہونے والا فوجی فائدہ اس بندرگاہ کی اہمیت کا محض ایک پہلو ہے۔

مارچ 2007ء میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو میں پاکستان کی وزارت برائے پورٹ و شپنگ کے ایک عہدیدار نے بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ کہا کہ صرف چند

سال میں گوادر پورٹ دنیا کی سب سے بڑی، سب سے بہترین اور سب سے مصروف ترین ڈیپ سی پورٹس میں شمار ہوگی۔ جس وقت اس کا افتتاح کیا گیا تو اسکی تین برتھیں فعال تھیں جبکہ مزید چودہ کی جگہ تھی۔ عہدیدار کے دعوے کے مطابق اسے خطے کی دیگر حریف بندرگاہوں کے مقابلے میں زبردست ایڈوانٹج حاصل تھا جس میں ایران کی چابہار کی بندرگاہ بھی شامل ہے جو پاکستان کی سرحد کے ساتھ خلیج عُمان کے ساحل پر بلوچستان اور سیستان میں واقع ہے۔ اس عہدیدار کے مطابق چابہار کی بندرگاہ طرح گوادر پورٹ بھی مرکزی میری ٹائم شپنگ لینز پر واقع ہے جو کہ خطے کے تیل اور گیس کے وسیع ذخائر اور خلیج فارس کی تیزی سے بڑھتی اور متحرک معیشتوں کے قریب واقع ہے۔ تاہم چابہار کے برعکس گوادر ایک ایسی بندرگاہ ہے جو پورا سال اور ہر موسم میں فعال رہنے والی ڈیپ سی پورٹ ہوگی جو آخر کار اس قابل ہوگی کہ بڑے بڑے آئل ٹینکر کے لیے جگہ دے سکے اور اس کے ساتھ ہی بہت کم وقت میں ڈوک ایریا کی طرف رسائی فراہم کرسکے (30)۔

پاکستان کا منصوبہ تھا کہ گوادر کو ایک ایسی پورٹ میں بدل دیا جائے جو تجارتی سرگرمی کے لیے ہمہ پہلو مرکز بن جائے جس کو آنے والے سالوں کے دوران سڑکوں، ریلوے، فضائی اور پائپ لائن کے نیٹ ورکس کے ذریعے ہمسایہ ملکوں سے منسلک کر دیا جائے۔ خطے میں ایک وسیع این ایل جی ٹرمینل، ایک سٹیل مل، ایک آٹو موبائل اسمبلی پلانٹ، ایک سیمنٹ پلانٹ اور ایک آئل ریفائنری تعمیر کی جائے۔ گوادر میں ایک اول درجے کا بین الاقوامی ائیر پورٹ تعمیر کرنے کا منصوبہ بھی ہے۔

بلاشبہ یہ پاکستان اور چین کے سٹرٹیجک مفادات تھے جن کی وجہ سے گوادر پورٹ کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لیے اس قدر تیزی سے کام کیا جارہا تھا (31)۔ اس کے علاوہ گوادر کے منصوبے میں یہ چین کی شمولیت ہی تھی جس کیوجہ سے علاقائی سیکورٹی مبصرین اس کی طرف مائل ہونے پر مجبور ہوئے تھے۔ چین نے اس منصوبے کے اصولی حصے دار کے طور پر اس کے پہلے مرحلے میں دوسو ملین ڈالر دیے جس کی وجہ سے اس کے اس منصوبے میں واضح مفادات ہیں جن میں خلیج فارس سے انرجی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی نقل وحرکت کے سپلائی روٹ کے طور پر اس کی نگرانی اور دوسری جانب پاکستان کے راستے اس کے تیزی سے ترقی کرتے مسلم اکثریتی خودمختار صوبے سنکیانگ کے لیے امپورٹ ایکسپورٹ کے متبادل راستے کو کھولنے کے حوالے سے ہیں۔ نئی دہلی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے لیے گوادر پورٹ کے کچھ سٹرٹیجک مضمرات ہیں جو واضح طور پر اس کے لیے فکرمندی کا باعث ہیں۔ اول یہ کہ گوادر پورٹ کا منصوبہ بھارتی بحریہ کی سٹرٹیجک منصوبہ بندی کو پیچیدہ کرتا ہے۔ یہ ان کئی بحری اڈوں میں سے ایک ہے جن کا مشرف نے اپنے افتتاحی خطاب میں ذکر کیا تھا جن میں سے دو بلوچستان کے ساحل پر واقع ہیں جن کو پاکستان اپنے بحری دفاع کو محفوظ اور مضبوط بنانے کے لیے تعمیر کررہا ہے۔ یہ ان کئی اشاروں میں سے ایک ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان بحر ہند میں قابل ذکر حد تک زیادہ اور بہتر دفاع پر مشتمل بحریہ کی موجودگی چاہتا ہے۔

دوئم یہ کہ گوادر کی تعمیر اور اس کے ساتھ ملحق سڑکوں، ریل اور پائپ لائنوں کے نیٹ ورک کی تعمیر سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ ان کا مطلب یہ

ہے کہ ان سے پاکستان کا افغانستان اور وسط ایشائی ریاستوں پر اثر ورسوخ مضبوط ہوگا جن کے ساتھ وہ ترکی ایران اور پاکستان کی جانب سے 1985ء میں قائم کردہ اکنامک کوآپریشن آرگنائزیشن کی صورت میں پہلے ہی باقاعدہ طور پر منسلک ہے اور جس کے موجودہ ارکان کی تعداد 1992 تک دس تک پہنچ چکی ہے جو کہ تمام مکمل طور پر اسلامی ممالک ہیں۔

سوئم یہ کہ بھارت ناگزیر طور پر گوادر کو اس طرح دیکھتا ہے کہ وہ چین کی طرف سے تعمیر کردہ کڑیوں میں سے ایک اور کڑی ہے جس کے ذریعے بھارت کے مشرقی، شمالی اور مغربی بارڈر کو گھیرے میں لے لیا گیا ہے۔ گوادر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے پاکستان اور چین کے درمیان تاریخی طور پر قائم فوجی اور معاشی تعلقات میں اضافہ ہوگا۔ اس کے نتیجے میں قوی امکان اس بات کا ہے کہ پاکستان چین کے ساتھ چین سنٹرک سٹریٹیجک شراکت میں جذب ہو جائے گا (32)۔

چوتھا اور آخری مضمر بھی کسی طرح کم اہمیت کا حامل نہیں۔ امریکہ اس خطے میں جس قسم کی جارحانہ انجنیئر نگ کی سرگرمیوں میں مصروف ہے بھارت کو اس کو بھی شدید سٹریٹیجک اہمیت کے طور پر دیکھنا اور اس کا حساب لگانا ہوگا۔ اگست 2007ء میں امریکی وزیر تجارت کارلوس گوٹیریز نے تاجکستان اور افغانستان کو ملانے کے لیے پیانگ دریا کے اوپر 673 میٹر طویل پل کی تعمیر کے منصوبے کے سلسلے میں اجلاس کی صدارت کی۔ اس پل پر 37 ملین ڈالر کی لاگت کا تخمینہ تھا اور اس پر سے روزانہ ایک ہزار ٹرک گذر سکتے ہیں جو کہ تاجکستان میں امریکی سرمایے سے بننے والا سب سے بڑا منصوبہ ہے۔ امریکی وزیر تجارت نے اس منصوبے کو وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا کے

درمیان طبعی اور علامتی رابطہ قرار دیا(33) جو کہ وسطی ایشیا کے خطے پر روسی غلبے کے خلاف ایک واضح چیلنج ہے۔تاہم بھارت بھی اس کو نظرانداز نہیں کرسکتا کہ امریکی سفارت خانے کی ایک پریس ریلیز میں کراچی کی طرف گرم پانی کی پورٹ کے طور پر توجہ دلائی گئی اور پاکستان کو اس پل کے ذریعے مستقبل کی ٹریفک کی جنوبی منزل قرار دیا گیا(34)۔

یقینی طور پر بھارت بھی انرجی کی ضرورت سے تحریک پاتے ہوئے وسطی ایشیائی ریاستوں تک رسائی کے لیے ٹرانسپورٹ کوریڈور بنانے کے منصوبے رکھتا ہے۔2000ء میں انٹرنیشنل نارتھ ساؤتھ ٹرانسپورٹ کوریڈور (آئی این ایس ٹی سی) کی شروعات اس سلسلے میں پہلا قدم تھا۔ابتداء میں اس کوریڈور نے بھارت کو روس اور ایران کے ساتھ ملایا اور پھر دیگر ایشیائی اور یورپی اقوام سے ملایا اور ایک ایسا منصوبہ بنا جس کا مطلب سوئز کینال کے ذریعے تجارت کے مقابلے میں یورپ کے ساتھ کہیں زیادہ شارٹ کٹ روٹ کی صورت میں تھا۔جبکہ سڑک، ریل اور سمندر کی صورت میں یہ روٹ اور بھی شارٹ ہوجاتا ہے اور ایران کی مرکزی بندر عباس کی پورٹ سے شمال کی طرف کیسپیئن سمندر اور اس کے پار سینٹ پیٹرز برگ گیٹ اور یورپ تک لے جاتا ہے۔اس کوریڈور کی ایک اور شاخ ترکمانستان تک جاتی ہے۔

نومبر 2001ء میں جب افغانستان سے طالبان کی حکومت کو ختم کیا گیا تو اسی کوریڈور کے اگلے مرحلے کے بھارتی اور ایرانی ارادوں کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔یہ کوریڈور بھارت کو ایران کے کم گنجان مشرقی علاقے سے ملاتا ہے۔افغانستان میں برسراقتدار آنے والے نئے شمالی اتحاد کے لیے بھارت نے امداد کے سلسلے میں جو پہلا

کام کیا وہ 218 کلومیٹر طویل زارنج دل آرام ہائی وے لنک کی تعمیر تھی جو کہ جنوب مغربی افغانستان سے ملحق ایرانی سرحد سے افغانستان کے موجود انٹرسٹی رنگ روڈ تک جاتی ہے اور وہاں سے فیض آباد اور اس سے آگے وسط ایشیا میں تاجکستان تک جاتی ہے۔نئی ہائی وے کا مقصد ایرانی شاہراؤں سے رابطہ قائم کرنا اور وہاں سے ایرانی بندرگاہ چاہ بہار تک رسائی ہے جو کہ اس وقت بھارتی معاونت سے زیرتعمیر ہے۔اس منصوبے کی اس حوالے سے تشریح کی جارہی ہے کہ اس کے ذریعے افغانستان کو سمندری راستہ حاصل ہو جائے گا جو کہ اس راستے سے چھوٹا ہے جو اسے پاکستان کی وساطت سے حاصل ہے۔ پاکستان کو اس معاملے میں بائی پاس کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ بھارت پاکستان سے کئی مرتبہ درخواست کر چکا تھا کہ وہ اسے زمینی راستے کے ذریعے افغانستان اور وسط ایشیا تک رسائی دے لیکن پاکستان کے انکار پر وہ اس منصوبے پر مجبور ہوا۔اس منصوبے سے پاکستان میں اضطراب پیدا ہونا فطری بات ہے جو کہ فی الحال اپنے گوادر پورٹ کے منصوبے کی کامیابی کے حوالے سے پریقین نہیں ہے۔

لہذا بلوچ قوم پرستی کو اس وقت دو قریبی اور حریف ٹرانسپورٹ کوریڈور کا سامنا ہے جو کہ زیرتعمیر ہیں اور جن کی کامیابی یا ناکامی پر خطے کے اقتصادی مستقبل کا دارومدار ہے۔مزید یہ کہ بلوچستان کی قبائلی اقلیت جو کہ مسلسل برابری ، انصاف اور حق خودارادیت کا مطالبہ کر رہی ہے اسے بھی انرجی سیکورٹی کے طاقتور محرکات کو تصادم کا سامنا ہے اور معاملے کی فوری نوعیت اور بلند تر سٹیک کی شدت بڑھ گئی ہے۔بلوچ اس وقت جس پوزیشن میں ہیں وہ ان کے فائدے والی پوزیشن ہے اور یہ کہ وہ اس

سارے قضیے میں مرکزی کردار کے حامل ہیں چاہے یہ کردار منفی ہو یا مثبت، اور اس قضیے کے روشن امکانات واضح ہیں۔ تاہم یہ بھی واضح ہے کہ پاکستان کے عزائم جیسا کہ مشرف کے افتتاحی خطاب سے واضح ہو جاتا ہے بلوچوں کو ایک طرف کرنا ہے جس سے بظاہر اس چیز کی عکاسی ہوتی ہے کہ ایسا کرنا ان کو آسان اور کم رسک کا حامل آپشن دکھائی دیتا ہے۔

بلوچ قوم پرستی: عزائم اور صلاحیت

بلوچ قوم پرست تحریک کوئی یک جہت قوت نہیں۔ نہ ہی اس کی قیادت اور طور طریقوں اور اہداف میں کسی قسم کی ہم آہنگی ہے۔ کچھ بلوچ قوم پرستوں کے لیے قوم پرستی کا دائرہ کار ان کی قبائلی شناخت سے آگے نہیں بڑھتا جیسے کہ مری یا بگٹی قبائل ہیں۔ دیگر کے لیے اس میں وہ تمام ستر قبائل شامل ہیں جو بلوچستان یا بلوچستان کے سرحدوں کے قریب رہتے ہیں۔ کچھ بلوچ قوم پرست مکمل آزادی چاہتے ہیں جبکہ بہت سے 1973ء کے آئین اور اس میں دیے گئے وفاقی نظام کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے مطالبات کو زیادہ خودمختاری تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ کچھ قبائل نے ریاست مخالف سرگرمیوں کو اختیار کر رکھا ہے جبکہ بلوچ قبائل کی اکثریت اپنی شکایات کے ازالے کے لیے ریاستی اداروں پر انحصار کی پالیسی رکھتی ہے۔ تاہم ان تمام اختلافات سے قطع نظر عملی طور پر اس بات کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا کہ اس وقت بلوچستان میں قوم پرستی کی جو لہر دوبارہ سے شروع ہوئی ہے اسلام آباد اس کو نظر انداز کر سکے گا۔

بلوچ بغاوت اس وقت حقیقی طور پر جس پیمانے پر پہنچ چکی ہے اس کے بارے

میں خاصی حد تک تنازعہ پایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر کتنے قبائلی لوگوں نے ہتھیار اٹھا رکھے ہیں اور یہ کہ کتنے قبائل براہ راست اس میں ملوث ہیں،؟ وہ اب تک کتنا نقصان پہنچا چکے ہیں اور بلوچستان کے کتنے علاقے پر انہوں نے اپنی عملداری قائم کر رکھی ہے؟۔اس تنازعے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ بلوچستان کا بڑا حصہ ناقابل رسائی ہے اور ذرائع ابلاغ کے نمائندے اور مبصرین ایک خاص حد تک سے آگے نہیں جا سکتے۔اس طرح اس علاقے میں ہونے والی لڑائی کے بارے میں کوئی قابل بھروسہ اور مصدقہ معلومات حاصل کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے بھی بہت تنازعہ ہے کہ بغاوت میں شریک قبائلیوں کی درست تعداد کتنی ہے۔ایک قریبی مبصر کا کہنا ہے کہ صرف بگٹی قبیلے کے لیے دس ہزار سے زائد افراد مسلح ہو کر لڑ رہے ہیں (36)۔پاکستان کے ایک موقر انگریزی اخبار دی نیشن کے مطابق جس نے پاکستان کے سابق صدر پرویز مشرف کے ق لیگ کے ایک اجتماع سے خطاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بگٹی ،مری اور مینگل قبائل کے سردار بالترتیب سات ہزار، نو ہزار اور دس ہزار لڑاکوں پر مشتمل مسلح لشکروں کی کمان کر رہے ہیں (37)۔تاہم پاکستانی فوج نے ترجمان نے اس آرٹیکل کے مصنف سے گفتگو کرتے ہوئے ان اعداد و شمار کو مضحکہ خیز قرار دیا اور کہا کہ ایک بکھری ہوئی اور تشدد کے غیر منظّم قسم کے واقعات پر مشتمل لڑائی کو بغاوت کہنا ویسے ہی بنیادی طور پر ایک گمراہ کن بات ہے۔

دوسری جانب ایک سینئر بیوروکریٹ نے مصنف سے گفتگو میں کہا کہ بغاوت میں شریک کل وقتی بلوچ جنگجوؤں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں (38)۔انہوں نے بتایا کہ بلوچ عسکریت پسند کوئی منظّم فوج یا تنظیم نہیں رکھتے اور بلوچ لبریشن آرمی یا

بلوچ لبریشن فورس محض کاغذ پر تحریر افسانہ یا کہانی ہے۔ انہوں نے کہا کہ حقیقت میں یہ صرف بگٹی اور مری قبائل ہیں جو کہ زیادہ تر تشدد کے ذمہ دار ہیں اور ان میں سے بھی صرف مری قبیلہ ہے جو زیادہ بڑا مسئلہ ہے۔ اس تکون کا تیسرا حصہ یعنی مینگل ہے جس کے بہت کم افراد مسلح بغاوت میں شریک ہیں اور عام طور پر ان کی جانب سے بہت کم حمایت بلوچ عسکریت پسندوں کو حاصل ہے اور اس میں سے بھی زیادہ تر اخلاقی حمایت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بغاوت اس حکومتی نقطۂ نظر سے محض امن وامان کا مسئلہ ہے جو صوبے کے ستائس میں صرف دو اضلاع کو درپیش ہے اور باقی علاقوں میں محض اس کا تھوڑا سا اثر ہے۔

حکومت کی جانب سے بلوچ باغیوں کے بارے میں اعداد وشمار میں حالات اور حکومت کی فوری سیاسی خواہشات کے مطابق تبدیلی آتی رہی ہے جس کے تحت اس مسئلے کو گھٹا یا بڑھا کر بیان کیا جاتا رہا ہے۔ مسئلے کی شدت کو گھٹا کر بیان کرنا اس وقت پاکستانی حکومت کے ان مقاصد کی عکاسی کرتا ہے جس کے تحت غیر ملکی سرمایہ کاروں کو راغب کرنا ہے اور ان کے لیے یہ تاثر بنانا ہے کہ بلوچستان میں بغاوت کا مسئلہ کوئی بڑا نہیں ہے۔ تاہم پیش کردہ یہ تصویر بہت مبالغہ آمیز طور پر امید افزاء ہے۔ مصنف کی اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں جن افراد سے بات ہوتی رہی ان میں شامل کئی اچھی پوزیشن اور تاثر کے حامل افراد نے آزادانہ طور پر اس بات کا اعتراف کیا کہ فی الحال تو بلوچ بغاوت بہت چھوٹی سطح کی قبائلی اور علاقائی بنیاد رکھتی ہے تاہم ان کا اصرار تھا کہ اس صورتحال کو پاکستانی حکومت کی جانب سے بری طرح نظرانداز کیے جانے کے باعث یہ نہایت تیزی کے ساتھ صوبے کے شہری علاقوں اور پڑھے لکھے بلوچ

نوجوانوں میں پھیل رہی ہے۔لہذا اگر اس صورت حال کوتبدیل نہ کیا گیا تو قوم پرستی کی یہ تحریک بالکل مختلف اور خطرناک رنگ اختیار کرسکتی ہے۔1970ء میں بلوچستان میں جو بغاوت ہوئی تو اس کی وسعت بہت زیادہ تھی جبکہ اس بار جو بغاوت ہورہی ہے اس کی سطح بہت محدود ہے۔

بلوچ قوم پرستی کی جڑیں پاکستان میں بہت گہری ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستانی ریاست کی جانب سے بلوچستان کو الگ تھلگ کرنے کی تاریخ اسی وقت شروع ہوگئی تھی جب قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں پاکستانی فوج کو جنوبی بلوچستان میں واقع قلات ریاست کی جانب سے آزادی کی تحریک کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس ریاست کوطاقت کے زور پر پاکستان میں شامل کرلیا گیا تھا۔اس کے بعد سے لیکر اگلے کئی عشروں تک بلوچستان میں وقفے وقفے سے بغاوت پھوٹتی رہی جس نے 1970ء کی دہائی میں بھرپور شکل اختیار کرلی جس کے بارے میں سلیگ ہیری سن کی کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ بات کی گئی ہے۔اگرچہ کوئی بھی بلوچ بغاوت پورے صوبے میں نہیں پھیل سکی۔اس طرح کوئی بھی تحریک سوائے چند قبائل کے زیادہ قبائل کوحرکت میں نہیں لاسکی تاہم مرکزی حکومت جس میں پنجاب کا غلبہ ہے اسکے خلاف بلوچوں میں شکایات اور ناراضگی اوران سالوں کے دوران سیاست کو جس طرح چلایا گیا اس بارے میں احساس بلوچوں میں بہت شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔اس ساری صورت حال سے بلوچ قوم پرستی کوایک نہ ختم ہونے والا ایندھن مل رہاہے(39)۔

حقیقت میں اس بات کے طاقتور شواہد موجود ہیں کہ بلوچستان کے ساتھ

پاکستان کے سیاسی نظام میں اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔مثال کے طور پر حال میں طریقیاتی طور پر کی جانے والی جدید سٹڈی میں پاکستان کی جی ڈی پی کو 2000-1972 کے عرصے یعنی اٹھائیس سالہ مدت کے دوران چاروں صوبوں میں ڈس ایگریگیٹ کیا گیا تو پتہ چلا کہ قومی جی ڈی پی میں صرف پنجاب اکیلا صوبہ ہے جس کے حصے میں اضافہ ہوا جبکہ صوبہ سرحد موجود پختون خواہ بمشکل اپنے حصے کو برقرار رکھ سکا جبکہ سندھ اور بلوچستان کے حصے میں دونوں کے لیے ایک فیصد کی کمی ہوئی۔ بلوچستان میں یہ 4.5 سے کم ہوکر 3.7 ہوگیا۔ یہ اعدادوشمار اس وقت اور بھی مایوس کن ہوجاتے ہیں جب انکو فی کس جی ڈی پی میں منقسم کیا جاتا ہے۔ پنجاب کی فی کس جی ڈی پی میں اس عرصے کے دوران 2.4 فیصد کا اضافہ ہوا جبکہ پختون خواہ کے لیے 2.2 فیصد کا اضافہ دیکھنے میں آیا۔ سندھ میں بشمول پاکستان کے معاشی مرکز کراچی کے یہ اضافہ صرف 1.7 فیصد رہا جبکہ بلوچستان میں صورت حال سب سے خراب یعنی 0.2 فیصد رہی۔ سٹڈی کے مصنفین قیصر بنگالی اور مہ پارہ صداقت کے مطابق اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے شواہد کی مزید تصدیق ہوگئی کہ ملک میں شمال جنوب کی معاشی تقسیم ابھر رہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس تمام صورت حال سے سب سے زیادہ بلوچستان ہی متاثر ہورہا ہے جو توازن کی کم ترین سطح پر ہے اور اس سے بھی بدترین یہ کہ مزید پسماندگی کی طرف بڑھ رہا ہے (40)۔

بلوچ رہنما کئی سال سے کہہ رہے ہیں کہ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ ان قواعد کو بہتر بنایا جائے جن کے تحت بین الحکومتی مالی تعلقات کو چلایا جاتا ہے بشمول یہ دونوں کہ مرکزی حکومت کی جانب سے صوبوں کے ساتھ ٹیکس

محصولات کے حوالے سے قابل تقسیم پول میں شراکت داری (نام نہاد عمودی تقسیم) اور یہ کہ صوبوں کا حصہ چاروں صوبوں میں کس طرح تقسیم کیا جاتا ہے (نام نہاد افقی تقسیم)۔صوبوں کے درمیان بظاہر اس بات پر اتفاق رائے ہو چکا ہے کہ عمودی تقسیم میں صوبوں کے حصے کو جو کہ اس وقت جمع شدہ محصولات پر 47.5 ہے سے بڑھا کر پچاس فیصد کیا جانا چاہیے۔

تاہم بلوچ جس سمت میں سب سے زیادہ تبدیلی کے خواہش مند ہیں اور جہاں صوبوں کے درمیان تا حال اتفاق رائے موجود نہیں، وہ افقی تقسیم کا شعبہ ہے۔ یہ اس وقت جس طریقے کے مطابق ہے اس کے مطابق صوبوں کے درمیان محصولات کو ان کی آبادی کے تناسب سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس فارمولے سے سب سے زیادہ فائدہ پنجاب اور اس کے بعد سندھ اور پختون خواہ کو ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کو بلوچستان جس کی آبادی پاکستان کی کل آبادی کا محض پانچ فیصد ہے اس کو ناگزیر طور پر سب سے کم حصہ ملتا ہے۔ اس کے مقابلے میں رقبے کے اعتبار سے یہ صوبہ پاکستان کے مجموعی رقبے کا 43.6 فیصد ہے اور یہاں پر قیمتی ساحل بھی ہیں جہاں ترقیاتی کام غیر معمولی حد تک کم ہیں اور بلوچستان کے حامیوں کا کہنا ہے کہ اس طرح دیکھا جائے تو بلوچستان کے لیے تقسیم کاری کا مختلف فارمولا ہونا چاہیے۔

اس قسم کا ایک فارمولا معروف ماہر اقتصادیات محبوب الحق مرحوم نے پیش کیا تھا جس میں صوبائی آبادی کو ایک پیچیدہ فارمولا کے تحت دیگر کئی فیکٹر سے بھی منسلک کیا گیا تھا یعنی ہر صوبے کی آمدنی کی سطح، طبعی انفراسٹرکچر کی عدم برابری اور سوشل سروسز اور مالی ڈسپلن اور محصولات جمع کرنے کی کوششوں میں فرق شامل ہے (41)۔

ایک اور طریقے میں متضاد آبادیاتی گنجانیت (IPD) کے فارمولے کی پیش کی گئی تھی جس کے مطابق صوبے کے سائز کو بھی اہمیت دی گئی تھی (42)۔ ان تمام پیش کردہ فارمولاز میں کہا گیا تھا کہ اگرچہ آبادی یقینی طور پر ایک سادہ ترین اصول ہوتا ہے تاہم یہ ہمیشہ ہی درست نہیں ہوتا لہذا پاکستان کو ایک ایسے فارمولے پر نہیں جما رہنا چاہیے جو کہ متنازعہ ہے اور بہت سے ملکوں بشمول بھارت کی جانب سے اس کو ختم کر دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ بلوچوں کی تمام شکایات کو صرف محصولات کی تقسیم کے فارمولے کو تبدیل کرنے سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بلوچ لیڈروں کا کئی سال سے یہ دعویٰ ہے کہ آبادیاتی طور پر وہ اپنے ہی صوبے میں بکھرے ہوئے اور الگ تھلگ ہیں جس کے اسباب کے بارے میں ذیل میں ذکر کیا جائے گا۔ اگرچہ بلوچستان میں نسلی ولسانی آبادی کے قابل بھروسہ اعداد وشمار تک پہنچ پانا بدنامی کی حد تک متنازعہ ہے اور صوبے میں آبادیاتی حالات اور رجحانات کے باعث اس تنازعہ کو اور بھی تقویت ملتی ہے۔ پاکستان کی پانچویں مردم شماری منعقدہ 1998ء کے مطابق ملک کی کل آبادی 13 کروڑ 32 لاکھ ہے۔ ملک کی اس آبادی میں بلوچی زبان بولنے والوں کا تناسب 3.57 فیصد ہے یعنی ان کی آبادی 47 لاکھ سے کچھ زائد ہے۔ ان میں سے لگ بھگ 35 لاکھ سے زائد بلوچ سپیکر بلوچستان میں رہتے ہیں۔ اس مردم شماری کے مطابق بلوچستان کی ٹوٹل آبادی 65 لاکھ ہے جو کل قومی آبادی کا 4.96 فیصد بنتی ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق بلوچستان کی 54 فیصد سے زائد آبادی کی مادری زبان بلوچی (بشمول براہوی لہجہ) ہے۔ صوبے کا دوسرا بڑا لسانی گروپ پشتون ہیں اور صوبے کے 29.6

فیصد لوگوں کی زبان پشتو ہے(44)۔

1972ء کی مردم شماری کا لسانی ڈیٹا کبھی بھی شائع نہیں ہوا۔اس طرح 1981ء کی مردم شماری کا ڈیٹا انفرادی کے بجائے خانہ شماری کی بنیاد پر اکٹھا کیا گیا جس کی وجہ سے بین المردم شماری اور انٹر گروپ موازنہ متاثر ہوا۔خود 1998 کے اعداد و شمار مکمل طور پر مستند تسلیم نہیں کیے گئے حتیٰ کہ سرکاری حلقوں میں بھی ان کو مکمل طور پر درست نہیں مانا گیا۔مثال کے طور پر ہوم سیکریٹری بلوچستان کی جانب سے 2005ء میں پارلیمانی کمیٹی برائے بلوچستان کو دی گئی ایک بریفنگ میں بتایا گیا کہ بلوچستان کی بلوچ آبادی 45 فیصد اور پشتون آبادی 38 فیصد ہے(45)۔

بلوچوں کے آبادیاتی علم کے بارے میں دو اہم حقائق کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔اول تو یہ کہ اوپر دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق اگر بات کی جائے تو پاکستان میں بلوچوں کی جو ٹوٹل آبادی ہے اس کا 23.9 فیصد حصہ بلوچستان سے باہر بالخصوص سندھ میں رہتا ہے۔دوئم یہ کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ بلوچستان میں بلوچ پہلے ہی اقلیت میں ہوں اور اگر بالفرض کوئی آبادی کے سرکاری اعداد و شمار کو تسلیم کرتا ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ بلوچ لگ بھگ یقینی طور پر اقلیت میں تبدیل ہو رہے ہیں۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ افغانستان میں گذشتہ ربع صدی سے جاری مسلسل جنگ کے نتیجے میں بلوچستان کے شمالی حصوں میں ہزاروں کی تعداد میں افغان مہاجرین کی ہجرت ہوئی جن میں سے اکثریت کا تعلق پشتونوں سے ہے۔بڑی تعداد میں یہ افغانی ادھر ہی آباد ہو چکے ہیں جس کے نتیجے میں بلوچستان میں آباد پشتون قوم کی آبادی میں یقینی طور پر اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ایک اور وجہ یہ ہے کہ گوادر پورٹ کی تعمیر سے بھی بڑی

کی تعداد میں لوگ بلوچستان میں آباد ہوئے ہیں جس کا تخمینہ پچاس لاکھ کے قریب ہے اور جو زیادہ تر غیر بلوچ ہیں۔اس طرح بلوچ ان دونوں قسم کے مہاجرین کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گئے ہیں اور ان کے لیے یہ فکر مندی کی صورت حال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدت ، عالمگیریت ، پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور معاشی پیش رفت کی نتیجے میں تبدیلی کی طاقتور قوتوں نے بلوچوں کو بہت پیچھے رہ جانے کے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔بلوچ پاکستانی آبادی کے غریب ترین، کم ترین تعلیم یافتہ اور کم ترین شہر مکانی کے حامل لوگ ہیں اور پاکستان میں تیزی سے بڑھتی ہوئی معاشی مسابقت کی صورت حال اور اقتصادی ماحول میں وہ آسانی سے مزید پس ماندگی کی طرف دھکیلے جا سکتے ہیں۔جزوی طور پر یہ مسئلہ ایک سٹرکچرل مشکل ہے جو کہ پالیسی میں ردوبدل کے ذریعے ہی ٹھیک نہیں ہوسکتا۔تاہم اس سارے مسئلے میں حکومت کو بھی بری الزمہ قرار نہیں دیا جاسکتا جس کی پالیسیوں میں کبھی بھی بلوچوں کی مشکلات کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔

بلوچستان کی موجودہ صورت حال کا ایک حتمی سبب جو کہ بلوچ قوم پرستی کے عزائم اور صلاحیت پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہو رہا ہے وہ عسکری سٹریٹیجک ماحول ہے جس نے صوبے کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت بلوچستان میں بغاوت کی جو صورت حال ہے وہ جن حالات میں جنم لے رہی ہے اس کو دنیا میں غیر مستحکم ترین اور متشدد ترین کے درجے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ہمسایہ افغانستان میں ایک خونریز جنگ ہو رہی ہے جس میں بہت سے ملکوں کی افواج شریک ہیں اور اس کا کوئی خاتمہ دکھائی نہیں دے رہا۔اس کے اثرات جس طرح بلوچستان

میں آ رہے ہیں وہ اس صورت میں ہے کہ افغانستان کی لڑائی سے بھاگنے والے لڑاکے یہاں پر پناہ لے رہے ہیں یا پھر یہاں پر ان قوتوں کو تربیت اور پناہ مل رہی ہے جو کہ افغانستان میں امریکہ کی زیر قیادت لڑنے والی افواج کی مخالفت ہیں 46 اور جس کی وجہ سے بلوچستان ایک قسم کا افغانستان کی جنگ میں دوسرا محاذ بن چکا ہے۔ بارہ اگست 2007ء کو پاکستانی صدر پرویز مشرف نے کابل میں ایک بڑے قبائلی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے حیران کن اعتراف کیا کہ افغانستان میں لڑنے والے عسکریت پسندوں کو پاکستان کی سرزمین سے مدد مل رہی ہے (47)۔

مبصرین کی جانب سے بلوچستان کے صدر مقام کوئٹہ کے بارے میں کئی مرتبہ کہا گیا کہ یہاں پر القاعدہ اور طالبان کے رہنما پناہ لیے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی جانب سے بھارت پر تواتر کے ساتھ یہ الزام عائد کیا جاتا رہا کہ وہ افغانستان اور ایران میں واقع اپنے قونصل خانوں کے ذریعے بلوچ باغیوں کو مدد بہم پہنچا رہا ہے (48)۔ اس بارے میں قیاس آرائیاں اپنے عروج پر پہنچ گئیں کہ بلوچستان میں کون سا ''غیر ملکی ہاتھ'' ملوث ہے اور بلوچ باغیوں کو اسلحہ اور دیگر ہر قسم کی مدد دینے کے ساتھ ساتھ سبوتاژ اور قتل و غارت میں ملوث ہے۔ بلوچستان میں چینی انجینئروں کے قتل کے بارے میں خاص طور پر ذمہ داری بلوچ عسکریت پسندوں کے علاوہ پاکستان میں موجود چینی مسلم صوبے کے یوغور باغیوں اور بھارت، ایران، افغانستان، متحدہ عرب امارات، روس اور حتیٰ کہ امریکہ کی حکومتوں پر عائد کی گئی۔ سازشی نظریات کے علم بردار ایک مضمون میں کئی قسم کی تضاد بیانیاں کی گئیں اور ایک غیر ممکنہ قسم کا نتیجہ اخذ کیا گیا کہ بلوچ قوم پرستوں کو سب سے زیادہ غیر ملکی امداد امریکہ روس اور بھارت

کی انٹیلی جنس تکون کی جانب سے مل رہی ہے جس کے بلوچستان میں کئی قسم کے مفادات ہیں(50)۔

بلوچستان میں غیر ملکی خفیہ سرگرمیوں کے حوالے سے قیاس آرائیوں کے بڑے حصے کو اہم سمجھنا چاہیے کیونکہ اس قسم کا خاطر خواہ ریکارڈ موجود ہے کہ اس علاقے میں اس قسم کی سرگرمیاں ہوتی رہی ہیں اس لیے ان پر سنجیدگی سے توجہ دینی چاہیے۔ پاکستان کے اس خطے میں بہت سے دشمن ہیں اور بلوچستان میں بلوچوں کی جو بغاوت جاری ہے اس میں خود بلوچوں سے زیادہ کئی دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔

بلوچ قوم پرستی پر پاکستان کا ردعمل

بلوچستان میں جاری بغاوت اور لڑائی کے بارے میں قابل بھروسہ اطلاعات کی ہمیشہ کمی رہی ہے اور خود پاکستان میں جو سیاست کی شدید گرما گرم صورت حال ہے اس میں غلط معلومات خوب پھلتی پھولتی ہیں اور پروپیگنڈہ معروضی حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔حتیٰ کہ تجربہ کار مبصرین بھی بعض جانتے بوجھتے ہوئے مختلف حلقوں کی طرف داری کرتے رہے ہیں (51)۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کی بغاوت کے خلاف لڑائی کی حکمت عملی کو احتیاط کے ساتھ دیکھا جائے۔اس طرح سیکورٹی فورسز پر جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں، کہ وہ غیر جنگجو افراد کو بلا اشتعال ہلاک کرتی ہے، لوگوں کو اجتماعی تشدد کا نشانہ بناتی ہے انہیں لا پتہ کر دیا جاتا ہے، بے ضابطہ طور پر گرفتار کیا جاتا ہے جو آئین میں دیے گئے انسانی حقوق اور دیگر تحفظات کے خلاف ہے، وہ بھی اس قدر لا شمار ہیں اور متاثر کن دستاویزی ریکارڈ رکھتے ہیں کہ ان کو آسانی سے نظر انداز کرنا ممکن نہیں (52)۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ اس لڑائی میں تمام اطراف کی جانب سے سفاکی اور ظلم کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔تاہم جب سرکاری

فورسز کی طاقت اوران کے پاس اسلحے کو دیکھا جاتا ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کی جانب سے اکثر و بیشتر اور زیادہ سنگین قسم کی کارروائیاں کی جاتی ہوں گی۔ پھر پاکستان کی نام نہاد ''تنازعے سے نمٹنے کی حکمت عملی'' کے بارے میں بااعتماد طور پر کیا کہا جاسکتا ہے؟ خاص طور یہ کہ توانائی کے حوالے سے پاکستان کی حکمت عملی اور بلوچستان میں قبائلی قوم پرستی کے درمیان تصادم کی صورت حال کیسے بن گئی؟

سب سے پہلے تو اسلام آباد کا جو تاثر ہے اس سے بھاگنا ممکن نہیں جو کہ 2006ء میں ایک بین الاقوامی کرائسز گروپ کے الفاظ میں اس صورت میں بیان کیا گیا کہ پاکستان نے اپنی امید فوجی حل کے ساتھ باندھ رکھی ہے(54)۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان غالب حد تک اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ بلوچوں کی قوم پرستی کی تحریک کو طاقت کے ساتھ کچل دیا جائے۔ اس بات کی عکاسی پاکستانی حکمرانوں کی اس حکمت عملی سے ہوتی ہے جوانہوں نے 1970ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے زمانے سے اپنا رکھی ہے۔ بعض صورتوں میں دیکھا جائے تو بلوچستان کی بغاوت سے نمٹنے کے لیے حکومت پاکستان نے اب جو پالیسی اپنا رکھی ہے وہ اپنی یک ذہنی، غیر لچک اور جامعیت کے اعتبار سے اس پالیسی سے کہیں زیادہ سفاک ہے جو 1970ء میں اختیار کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں سلیگ ہیری سن نے اپنے تازہ ترین جائزے میں لکھا تھا وہ یقینی طور پر درست ہے کہ مشرف حکومت بلوچوں کی بغاوت کچلنے کے لیے اپنے پیش رووں کے مقابلے میں زیادہ نئے اور زیادہ جابرانہ ہتھکنڈے استعمال کررہی ہے(55)۔ اس کی وجہ میرے خیال یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حکومت پر انرجی کے حوالے سے دباؤ بڑھ چکا ہے اور دیگر کئی عوامل بھی ہیں جس کی وجہ سے حکومت

بلوچستان میں بغاوت سے نمٹنے کے لیے یہ حکمت عملی اپنائے ہوئے ہے۔ اسلام آباد نے جو حکمت عملی اپنا رکھی ہے اس لیے آخری تجزیے میں جو بہترین اصطلاح ہے اس کو ''صفر برداشت ماڈل'' کہا جا سکتا ہے۔

اس ماڈل کے تین مرکزی عناصر ہیں۔ ان میں سے پہلے دو تو 1970ء کے طریقہ کار کو جاری رکھنا ہے:

1: انفارمیشن مینجمنٹ: نفسیاتی جنگ، انفارمیشن عمل کاری اور پبلک ڈپلومیسی:

اس میں ایک اہم ترین عنصر جسے آج کل کی اصطلاح میں ''نفسیاتی جنگ'' یا ''انفارمیشن عمل کاری'' اور اگر غیر ملکی شرکاء کے سامنے معاملہ پیش کرنا ہو تو ''پبلک ڈپلومیسی'' کہتے ہیں۔ اگرچہ اس بارے میں پیائش کرنا بہت مشکل ہے تاہم اس حکمت عملی کے سلسلے میں حکومت نے جو طریقہ کار اپنایا ہے اس کے مہدف شرکاء بالخصوص مغرب پر مطلوبہ اثرات مرتب کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستانی فوج کے ترجمان نے اس حکمت عملی کے مطابق گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ بلوچستان میں اصل مسئلہ وہاں کا سرداری یا تمن داری نظام ہے جس میں عام بلوچوں کو قبائلی سرداروں اور تمن داروں کے مقابلے میں کمتر ین صورت میں رکھا جاتا ہے۔ یہ قبائلی رہنما، سردار یا تمن دار عام بلوچوں کے لیے خدا کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کرتے ہیں اور اپنی عمل داری برقرار رکھنے کے

لیے سخت سزائیں دیتے ہیں جن میں سر اٹھانے والوں کو قید کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ موت کے گھاٹ تک اتار دیا جاتا ہے۔

فوج کے نقطۂ نظر سے بلوچستان میں جاری نام نہاد بغاوت بلوچستان میں دم توڑتے ہوئے ظالمانہ اور جابرانہ قبائلی نظام کی آخری ہچکی ہے۔ فوج کے بقول اس کا بلوچوں کے حق خود ارادیت یا حکومتی جبر کے خلاف بلوچوں کی مزاحمت سے بہت کم تعلق ہے بلکہ اس کا زیادہ تر تعلق بلوچستان کے فرسودہ اور ظالمانہ قبائلی نظام کو بچانے سے ہے دوسرے الفاظ میں یہ قبائلی سردار اور تمن دار ہیں جو اپنی عمل داری اور عیاشی کو بچانے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ فوجی ترجمان کا کہنا تھا کہ سردار جدید نظام سے ڈرتے ہیں کہ اگر حکومت کی مدد سے علاقے میں سڑکیں، سکول، بجلی، طبی مراکز اور پانی کی فراہمی جیسی سہولتیں فراہم کر دی گئیں اور جمہوری ادارے قائم کر دیے گئے تو ان کی بادشاہت اور سرداریاں ختم ہو جائیں گی۔ چنانچہ اپنے اس بچاؤ کے لیے وہ قبائلیوں کو متحرک اور مسلح کر رہے ہیں کہ وہ حکومت کے خلاف لڑیں۔ اس سلسلے میں وہ حکومت پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ ان کے قبائلی علاقوں پر قبضہ کر رہی ہے اور ان کے قدرتی وسائل کو ہتھیا رہی ہے جو کہ مقامی قبیلوں کی ملکیت ہیں 57۔

اس طرح قبائلی قیادت کو ایک مخصوص طریقے سے ملزم ٹھہرانے اور بدنام کرنے کے علاوہ بغاوت کی سطح کو کم سے کم تر کرنے کی پالیسی بھی اپنائی گئی۔ اس کے علاوہ بغاوت میں شریک عسکریت پسندوں کی تعداد کو کم ظاہر کر کے، ان کی بغاوت کے سلسلے میں کوئی حقیقی نظریاتی تحریک کی غیر موجودگی اور ان کی قبائلی بنیادوں کو گھٹا کر بیان کرنے کو بھی ان کے خلاف پروپیگنڈے میں استعمال کیا گیا۔ بلوچستان میں

عسکریت کے بارے میں جو بھی لکھا گیا اسے فوج کے ترجمان کی جانب سے بے بنیاد اور بناوٹی قرار دیا گیا: ''یہ کوئی بغاوت نہیں۔ بلوچ عسکریت پسند کرائے کے جنگجو ہیں۔ان کی کوئی قوم پرست یا نظریاتی تحریک نہیں (58)۔''فوجی ترجمان کا کہنا تھا کہ ٹوٹل ستر قبائل میں سے صرف تین لڑرہے ہیں جن میں زیادہ تر جنگجوؤں کا تعلق بگٹی، مینگل اور مری قبائل سے ہے۔ یہ قبائل صوبے کے 27 اضلاع میں سے صرف تین اضلاع ڈیرہ بگٹی، کوہلو اور خضدار میں ہیں اور انہیں دیگر بلوچ قبائل کی طرف سے بہت کم حمایت حاصل ہے اور ان تین قبائل میں بھی بہت زیادہ گروہ بندی موجود ہے اور زیادہ تر قبائلی لوگ حکومت کی حمایت کررہے ہیں۔

قصہ مختصر حکومت کی جانب سے پروپیگنڈے کی جو سٹرٹیجی ہے اس میں بلوچوں کی سیاسی قیادت کو کم تر اور زوال پذیر بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ بلوچوں کے مقاصد اور نصب العین کو اس طریقے سے پیش کیا جارہا ہے جس کے بعد ان کے ساتھ سیاسی معاہدے اور سودے بازی کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے اور ساتھ ہی حکومت کے اس عزم کو جواز فراہم کیا جاتا ہے کہ ان کی قوم پرست تحریک پر مبنی بغاوت کو کچلنے کے لیے کوئی بھی حربہ استعمال کیا جائے وہ ٹھیک ہے۔

2: سیاسی مینجمنٹ، سیاسی خوف وہراس، دھمکیاں، علیحدگی پسند قیادت کا خاتمہ، تقسیم کرو اور حکومت کرو، قبائلی قیادت سے سودے بازی

بلوچ قوم پرست سیاسی قیادت کے خلاف کریک ڈاؤن کے حوالے سے حکومتی اور بلوچ موقف کے درمیان فطری طور پر فرق موجود ہے۔

اس حوالے سے حکومتی کارروائیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے(59) اوراس کو دہرانے کی ادھر چنداں ضرورت نہیں۔عمومی طور پر ان کارروائیوں میں بلوچ سیاسی کارکنوں کی اجتماعی گرفتاریاں جوکئی اعداد وشمار میں سینکڑوں اور ہزاروں کی صورت میں ہیں۔خود بلوچ قومیت سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کے درمیان اختلافات اور تصادم کا اپنے مقاصد کے لیے استعمال جو بڑے بلوچ قبائل کے درمیان بھی ہوسکتا ہے اور خود کسی قبیلے کے اندر بھی۔اس کے علاوہ بلوچستان کی دو بڑی قومیتوں یعنی پشتونوں اور بلوچوں کے درمیان تقسیم اور

بداعتمادی کو جنم دینا وغیرہ۔اس طرح ان دو نسلی و لسانی گروپوں کے درمیان تقسیم اور ان کی الگ سیاسی پارٹیوں کی وجہ سے وہ صوبوں میں سیاسی مقام بنانے کے لیے ایک دوسرے کے مقابل ہی صف آرا ہوتے ہیں۔ان دونوں گروپوں کے درمیان حریفانہ تعلقات کی صورت میں حکومت کو موقع مل جاتا ہے وہ مداخلت کرے اور اپنے مقاصد حاصل کرے۔

فروری 2003ء کے اوائل میں جب بلوچ بغاوت ابھی اس قدر بھڑکی نہیں تھی تو صدر مشرف نے ایک سابق ریٹائرڈ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل عبدالقادر بلوچ کو بلوچستان کے گورنر کے اہم عہدے پر فائز کیا۔صرف چھ ماہ بعد انہیں کرپشن کے مبینہ الزامات پر اس عہدے سے معزول کر دیا گیا جبکہ سرکاری ذرائع کے مطابق ان کی معزولی کے لیے یہ عذر بھی پیش کیا گیا کہ ان کا تعلق بلوچستان کے نسبتاً چھوٹے قبیلے زہری سے ہے اس لیے وہ بلوچستان میں امن کے لیے مناسب کردار ادا نہیں کر سکتے کیونکہ بلوچستان کے تنازعے میں جو سردار ملوث تھے ان کا تعلق بہت طاقتور قبائل سے تھا(60)۔مصنف کو ایک قابل ذکر سیاسی شخصیت سے ملنے والی غیر مصدقہ اطلاعات سے پتہ چلا کہ جنرل عبدالقادر بلوچ نے صدر مشرف کو ناراض کر دیا تھا کیونکہ انہوں نے اپنے طور پر نواب اکبر خان بگٹی سے بات کر کے ڈیرہ بگٹی میں معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی تھی۔اس سے پہلے جب وہ کور کمانڈر کوئٹہ تھے تو انہوں نے اس سلسلے میں کچھ کامیابی بھی حاصل کر لی تھی (61)۔

جنرل عبدالقادر بلوچ کی جگہ گورنر بلوچستان بنانے کے لیے دو شخصیات پر غور کیا گیا۔ان میں ایک ریٹائرڈ جنرل علی جان اورکزئی کا تعلق پشتونوں کے اورکزئی

قبیلے 62 سے تھا جبکہ دوسرے اویس احمد غنی تھے جو کاکڑ پشتون تھے اور ان کا بلوچستان سے آبائی تعلق تھا (63)۔اویس احمد غنی بلوچستان کے گورنر بنا دیے گئے۔نسلی تعلق اور ایک پشتون لیڈر کی ممکنہ رضامندی کے بعد بلوچستان میں معاملات کو سلجھانے کے لیے فوجی طاقت پر بھرپور انحصار یقینی طور پر مشرف کی توقعات کے مطابق تھا۔امر دلچسپ ہے کہ وہی عبدالقادر بلوچ جو کبھی مشرف کے وفادار دوستوں میں شامل تھے انھوں نے اپنی برطرفی کے فوری بعد خود کو ان بااثر پاکستانی حلقوں کی صف میں شامل کر لیا جو مشرف پر صدارت یا فوج کی سربراہی میں سے ایک عہدہ چھوڑنے کے لیے ان پر دباؤ ڈال رہے تھے (64)۔

بلوچستان کی جدوجہد میں پرتشدد کارروائیوں کی ایک طویل تاریخ رہی ہے۔گرفتاریاں، قید، قتل اور بلوچ لیڈروں کی غیر رضاکارانہ جلاوطنی ایک ایسی حکمت عملی ہے جسے ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اپنے دور میں استعمال کیا۔اس حوالے سے تین حالیہ واقعات نے بہت شہرت حاصل کی۔ان میں پہلا واقعہ نواب اکبر بگٹی کا قتل تھا جنھیں کوہلو میں مری قبائل کے علاقے میں ایک غار پر حملہ کر کے قتل کیا گیا تھا جہاں وہ چھپے ہوئے تھے۔وہ بلوچوں کی قوم پرست جمہوری وطن پارٹی کے ایک بااثر لیڈر تھے۔فوج کی جانب سے ایک زبردست کارروائی کے نتیجے میں بگٹی بلوچوں کے اس اسی سالہ لیڈر کی اپنے کئی ساتھیوں سمیت ہلاکت کے نتیجے میں ایک کرشماتی اور زیرک لیڈر منظر نامے سے ہٹ گیا اور اس کی موت کے نتیجے میں بعض حلقوں کے مطابق ''بلوچستان میں بغاوت کی لہر کو شدید دھچکا لگا اور حکومت کو اس بلوچ تحریک کے اوپر ایک فیصلہ کن برتری حاصل ہوگئی (65)۔''

نواب اکبر بگٹی جو کئی سال پہلے بلوچستان کے گورنر اور وزیر اعلیٰ کے طور پر کام کرتے رہے تھے اور انہوں نے اس زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ کام کیا تھا جب بلوچستان میں 1970ء کی شدید بغاوت ابھری تھی اور وہ ایک قبائلی گوریلا جنگجو کے روایتی تصور پر بمشکل ہی پورا اترتے تھے۔ حالیہ سالوں کے دوران وہ جنرل پرویز مشرف کے لیے سب سے شدید سر درد بن گئے تھے۔ تاہم ان کی ہلاکت کے حوالے سے بھی کئی تنازعات ہیں۔ کچھ حکومتی ترجمانوں کا کہنا ہے کہ وہ فوج کے ساتھ لڑائی کے دوران غار کی دیوار گرنے سے ہلاک ہوئے جبکہ حکومت کے مخالفین کا کہنا ہے کہ انہیں ریاست کے احکامات پر دانستہ قتل کیا گیا۔

دوسرا واقعہ بگٹی کے قتل کے فوری بعد ہی پیش آیا جو کہ سابق وزیر اعلیٰ بلوچستان اور بلوچستان نیشنل پارٹی کے سربراہ سردار اختر مینگل کی گرفتاری کی صورت میں تھا۔ اختر مینگل سردار عطاء اللہ مینگل کے بیٹے تھے جو کہ مینگل قبیلے کے عمر رسیدہ سربراہ اور 1970ء کی بلوچ بغاوت کا مرکزی کردار تھے۔ اختر مینگل کو نومبر 2006ء میں گرفتار کیا گیا اور ان کے خلاف کراچی کی انسداد دہشت گردی کی عدالت میں غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا جو کہ بعض مبصرین کے مطابق ایک من گھڑت الزام تھا۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کو موصولہ درخواست کے مطابق ان سے عدالت میں غیر انسانی سلوک کیا گیا اور ایک پنجرے نما شے میں بند کر کے عدالت میں پیش کیا گیا جہاں ان کا اپنے وکلاء سے رابطہ تک ممکن نہ تھا۔ مینگل کے ذریعے دیگر بلوچ لیڈروں کو یہ سبق دیا گیا کہ اگر انہوں نے ریاست کے ساتھ ٹکرانے کی کوشش کی تو ان کے ساتھ بھی یہ سلوک کیا جا سکتا ہے(66)۔ انہیں اوائل 2007ء میں بغاوت

کے الزام سے بری کر دیا گیا لیکن وہ اوائل 2008ء تک دیگر الزامات کے تحت جیل میں ہی بند رہے۔

تشدد کا تیسرا بڑا واقعہ نومبر 2007ء میں پیش آیا جو کہ پاکستانی سیکورٹی فورسز کی جانب سے گوریلا لیڈر نواب زادہ بالاچ مری کے قتل کی صورت میں تھا جو کہ 1970ء کی بلوچ بغاوت کے سرکردہ لیڈروں میں شامل نواب خیر بخش مری کے چھ بیٹوں میں سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ کالعدم بلوچستان لبریشن آرمی سے لیڈر بالاچ مری کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اکبر بگٹی کے قتل کے فوری بعد فرار ہو کر افغانستان چلا گیا تھا۔ بالاچ مری کے قتل کی تفصیلات اگرچہ سامنے نہیں آسکیں تاہم مری قبائل کے لوگوں کی جانب سے اس کے قتل پر شدید احتجاج سے معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے(67)۔

پاکستان کے ایک سینئر اور انتہائی معزز صحافی اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

''چیف آف آرمی سٹاف کی حکمرانی میں چلنے والے اس ملک میں فوج کے اختیار کو چیلنج کرنے کی جرات کرنے والے کو کئی بار سوچنا پڑے گا۔ اکبر بگٹی کو اس جرم میں اپنی زندگی سے محروم ہونا پڑا۔ اختر مینگل نے صرف فوج پر ایک زبانی حملہ کیا اور اس کی سزا یہ ہے کہ وہ غیر معینہ مدت کے لیے جیل میں بند پڑا ہے۔68''

3: فوجی مینجمنٹ، سیکورٹی فورسز کی تعیناتی میں اضافہ، نئی چھاؤنیوں، فوجی سڑکوں اور دیگر انفراسٹرکچرز کی تعمیر اور فوجی جبر پر انحصار

1970ء کی دہائی کی بغاوت اور موجودہ دور کی بغاوت کے درمیان مینجمنٹ کی سٹریٹیجی میں شدید فرق دیکھنے میں آیا ہے جو فوج کے دائرہ اختیار میں وجود رکھتا ہے۔ان دنوں ایسے منصوبے زیرِ عمل ہیں جس کے تحت بلوچستان کی سیکورٹی کو مزید مرکزی کنٹرول میں لانا ہے کیونکہ مرکزی حکومت نگرانی اور پولیسنگ کی بہتر صلاحیت رکھتی ہے اور ساتھ ہی اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ صوبے میں ڈرامائی طور پر اپنی باقاعدہ فوج کی موجودگی اور پہنچ میں اضافہ کرے۔یہ پلان کچھ اس طرح ہے:

☆بلوچستان میں تین مزید چھاؤنیوں کا قیام اور پہلے سے موجود دو چھاؤنیوں کو مضبوط بنانا جو سبی اور کوئٹہ میں واقع ہیں۔ان میں سے ایک چھاؤنی گوادر میں جنوبی ساحل پر قائم کی جا رہی ہے جبکہ دوسری کوہلو میں بن رہی ہے جو کہ سرکش

مری قبائل کا علاقہ ہے۔اس طرح تیسری چھاؤنی ڈیرہ بگٹی میں قائم کی جارہی ہے جو کہ نہ صرف سرکش بگٹی قبائل کا علاقہ ہے بلکہ سوئی کا علاقہ بھی یہیں پر واقع ہے جہاں پر قدرتی گیس ک وسیع ذخائر موجود ہیں۔

☆2010ء تک مقامی قبائل پر مشتمل علیحدہ پولیس فورس لیویز کو ختم کرنا ہے جس کی ذمہ داری نہام نہاد بی کیٹگری میں آنے والے علاقوں میں امن وامان کی صورت حال کو سنبھالنا جو کہ غیر شہری علاقے ہیں اور صوبے کے پچانوے فیصد علاقے پر مشتمل ہیں۔اس قبائلی پولیس کو باقاعدہ صوبائی پولیس میں ضم کردیا جائے گا جو کہ کیٹگری اے کے علاقوں میں امن وامان کی ذمہ دار ہے جو کہ شہری علاقے ہیں اور صوبے کے محض پانچ فیصد علاقے پر مشتمل ہے(69)۔

حکومت اس وقت پاکستان کے انرجی سیکورٹی کے مسئلے میں ذہنی طور الجھی ہوئی ہے جو کہ بلاشبہ ملٹری مینجمنٹ سٹرٹیجی کے گرد گھوم رہی ہے۔جس کا مقصد ظاہر ہے کہ پولیسنگ اور نگرانی کی صلاحیتوں کے حوالے سے حکومت کی قابلیت میں اضافہ کرنا ہے۔ان چیزوں کے پرعزم طریقے سے نفاذ کے بغیر پہلے بیان کیے گئے انرجی کے حوالے سے تین اہم منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ مکمل نہیں کیا جاسکتا جو کہ ایک ایسا ایشو ہے جسے حکومت خوب سمجھتی ہے۔ان تین منصوبوں میں اول بلوچستان میں انرجی کے ذخائر کی تلاش ہے کہ ابھی تک صوبے میں صرف جزوی نوعیت کے زخائر تلاش کیے گئے ہیں۔دوئم صوبے میں گیس اور تیل کی پائپ لائنیں گذارنا اور سوئم سنٹرل ایشیا اور سنکیانگ تک ایک ٹرانسپورٹ کوریڈور کے سلسلے میں انفراسٹرکچر تعمیر کرنا شامل ہیں۔اس طرح بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے جس میں پاکستان کی معاشی

ترقی، حریف ہمسایے کے حوالے سے سرحدوں کی سلامتی اور مستقبل میں ایک بنیادی الائنس کی تیاری جس میں چین اور امریکہ شامل ہیں۔ اسلام آباد میں بیٹھی فوجی اسٹیبلشمنٹ سمجھتی ہے کہ اسے ایک چھوٹی سی نسلی قبائلی اقلیت کے مطالبات کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے ریاستی طاقت کے پرتشدد استعمال پر انحصار کرنا چاہیے جو کہ ان کے پاس فوری طور پر موجود ہے کیونکہ مذکورہ نسلی قبائلی اقلیت کے جو مطالبات ہیں وہ ریاست سے متضاد ہیں۔

ایسی بات نہیں ہے کہ حکومت اور فوج کے اعلیٰ حلقوں میں بلوچ اقلیت کے مطالبات کے بارے میں سوچا ہی نہیں گیا۔ ستمبر 2004ء میں اس وقت کے وزیراعظم چودھری شجاعت حسین نے بلوچستان کے بارے میں ایک پارلیمانی کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا جو اس لیے بنائی گئی تاکہ صوبے میں صورت حال کا جائزہ لیا جائے اور ایسی سفارشات مرتب کی جائیں کہ صوبے کے حالات کو بہتر بنایا جائے اور بین الصوبائی ہم آہنگی عمل میں لائی جائے۔ اس کمیٹی نے 2005ء کے اواخر میں ایک قابل تحسین اور جامع رپورٹ پیش کی۔ یہ سفارشات جو سات صفحات پر مشتمل تھیں ان میں کوئی درجن بھر تجاویز پیش کی گئیں جن میں کئی پروگرامز اور اصلاحات پر زور دیا گیا جیسے قدرتی گیس کے ریونیو میں صوبے کے حصے میں اضافہ، بلوچستان کا ڈومیسائل رکھنے والے افراد کے لیے وفاقی ملازمتوں کے کوٹے پر سختی سے عمل درآمد، گوادر پورٹ اتھارٹی میں زیادہ صوبائی نمائندگی، صوبے میں خشک سالی کے خاتمے کے لیے نئے ڈیموں اور آبی ذخائر کی تعمیر اور صوبے بھر میں موجود وفاقی حکومت کی کوسٹ گارڈ اور ایف سی کی چوکیوں پر بلوچ شہریوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک کا خاتمہ شامل

ہیں(70)۔

تاہم جب صوبے میں نئی چھاؤنیوں کا حساس معاملہ آتا ہے تو کمیٹی گول مول قسم کی زبان استعمال کرتی ہے جس میں چھاؤنیوں کی تعمیر موخر کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ پہلے بلوچستان کے دیگر بڑے مسائل کو حل کرلیا جائے'' تاکہ اس وقت خیر سگالی کا جو ماحول قائم ہو چکا ہے وہ برقرار رہے۔71'' یہ بات واضح ہے کہ کمیٹی کے ارکان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ چھاؤنیوں کی تعمیر کو روکا نہیں جاسکتا اور شاید روکنا بھی نہیں چاہیے۔

اگرچہ فوجی قیادت کی حامل حکومت کم ازکم گذشتہ حالیہ سالوں کے دوران ایسے سیاسی آپشنز پر غور کرتی رہی ہے جنہیں ملک کی سیاسی اشرافیہ کی جانب سے سامنے لایا گیا تاہم بلوچ اقلیت کی حقیقی شکایات کو دور کرنے کے سلسلے میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ فوجی اسٹیبلشمنٹ زیادہ سنجیدہ نہیں۔اس حقیقت کا اظہار مصنف کی جانب سے 2007ء میں ایک سینئر بیوروکریٹ جو کہ بلوچستان میں بھی کام کرچکے ہیں، سے کی گئی بات چیت میں بھی سامنے آتا ہے۔ یہ بیوروکریٹ بلوچ سردار کے ساتھ کسی قدر ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ بلوچ سرداروں نے اکثر ان سے یہ بات کرتے رہے ہیں کہ بلوچستان میں جو بڑے بڑے منصوبے حکومت کی طرف سے بنائے گئے جن میں گوادر ڈیپ سی پورٹ کا قیام اور کچھی کینال جیسے منصوبے شامل ہیں جن سے بلوچوں کی زندگی پر بہت سے اثرات مرتب ہوں گے لیکن ان منصوبوں میں بلوچوں کو سرے سے شامل ہی نہیں کیا گیا۔سینئر بیوروکریٹ کا کہنا ہے کہ بلوچ سرداروں کی یہ شکایت درست ہے اور یہ منصوبے ایک فوجی مائنڈ سیٹ کی پیداوار ہیں

جن میں بلوچستان کے عام لوگوں کو ساتھ لے کر نہیں چلا جا رہا ہے۔ یہ سوچ اور نقطۂ نظر فوج کے انٹیلی جنس افسروں میں بہت نمایاں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر بلوچ سرداروں کو ساتھ لے کر چلا جاتا تو فوج کے لیے مشکلات خاصی حد تک کم ہو جاتیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر سیاسی مکالمہ کا دروازہ کھلا رکھا جائے تو سب کچھ ممکن ہوتا ہے حتیٰ کہ سرداروں کا طرز عمل چاہے خراب کیوں ہی نہ ہو (72)۔

میرے مذاکرہ کار نے بلوچ بغاوت کے سلسلے میں جس طرح الزام تراشی بیرونی عناصر پر عائد کرنے کی سوچ کا اظہار کیا وہ سوچ سرکاری حکام میں اسی حوالے سے عمومی رویے سے بھی زیادہ بڑھ کر تھی اور اس میں مجھے بلوچوں کو یک طرفہ طور پر بدنام کرنے کے رویے کی بڑے اچھے طریقے سے رخصتی دکھائی دی جو کہ اس سرکاری مہم کی خصوصیات میں سے ایک تھی جس کا پہلے ذکر کیا گیا۔ اس نے سیاسی مذاکرات کی معاملے کو سلجھانے کی طاقت پر جس طرح غیر معمولی حد تک اعتماد کا اظہار کیا وہ بہت متاثر کن تھا۔ وہ مجھے غیر معقول نہیں لگا۔ اس کے برعکس اس نے گفتگو کے دوران باغیوں کی غیر ملکی امداد کے بارے میں تفصیل سے بات کی اور زور دے کر کہا کہ چند سردار پاکستانی حکومت کے ساتھ ٹکر نہیں لے سکتے جب تک کہ انہیں بیرونی اطراف سے مدد نہ ملے۔ تاہم اس کا کہنا تھا کہ غیر ملکی مداخلت کے باوجود سب کچھ ممکن ہے۔

اس عہدیدار کے خیال میں جہاں تھوڑا بہت ڈانٹ ڈپٹ کی اجازت دی جا سکتی ہو وہاں ناراض سرداروں کو باقاعدہ طریقے کے ساتھ بدنام کرنے کی مہم کے نتیجے میں فائدے کے بجائے نقصان ہو رہا ہے۔ ان کو جتنا زیادہ ڈرایا دھمکایا اور ذلیل کیا جاتا ہے اتنا ہی بلوچوں کو اور زیادہ یقین ہونے لگتا ہے کہ حکومت کا اصل مقصد انہیں الگ

تھلگ کرنا اور ان کے ہی اپنے صوبے میں انہیں دوسرے درجے کے شہریوں میں تبدیل کرنا ہے۔

بلوچ مسئلے کو سلجھانے کے لیے اس واضح سیاسی اپروچ کی سرکاری تصدیق کو بعض حلقوں (بشمول انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی رپورٹ) کے اس موقف سے گڈمڈ یا الجھایا نہ جائے کہ 2007ء کے اواخر میں پاکستان میں آزادانہ اور منصفانہ الیکشن کی صورت میں اس مسئلے کو آسانی کے ساتھ حل کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے دعووں کی پختگی کا انحصار نتائج کے حوالے سے بہت زیادہ امیدوں پر ہے جن میں یہ خیال کیا جارہا ہے کہ جمہوریت کی طرف ٹرانزیشن یا دوسرے لفظوں میں الیکشن، سویلین قانون سازی کے اداروں اور ووٹروں کے احتساب کے نتیجے میں سیاسی رویوں میں تبدیلی سے اس خطرناک قبائلی بغاوت کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس چیز کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ 1970ء میں جب بلوچستان میں بغاوت پھوٹی تو اس وقت ملک میں سویلین حکمرانی کا دور چل رہا تھا جس کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے بلوچ قیادت کی طرف سے خودمختاری کے مطالبے کے سلسلے میں اتنی ہی معمولی رغبت ظاہر کی تھی جتنی کہ آج کی فوجی قیادت کی ہے۔ پاکستان کا جمہوری عمل کوئی جادوئی قالین نہیں جو پاکستان کو تیزی کے ساتھ بہتر حکومت کی سمت میں لے جائے گا۔

اس وقت بلوچستان کی علاقائی صورت حال میں جو طاقتور جیو پولیٹیکل اور جیو سٹرٹیجک طاقتیں سرگرم عمل ہیں جن کے بارے میں ہم بات کر رہے ہیں جیسے بھارت، چین، روس، وسط ایشیا، ایران اور امریکہ اور خود بلوچستان کی نیم ریاستی

صورت حال یہاں پر موجود ہے جس کو دیکھتے ہوئے اس مسئلے کا آسانی کے ساتھ کوئی حل نکلنا دشوار دکھائی دیتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوری الیکشن اس مسئلے کے حل میں بہت اہم ہیں لیکن یہاں پر الیکشن ، جس میں فوجیوں کی جگہ سویلین آجائیں، سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت ہے جن کے ذریعے بلوچستان کی تیزی سے بگڑتی ہوئی صورت حال کو ٹھیک کیا جاسکے۔اس سلسلے میں محض پاکستان کی انرجی سیکورٹی سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ بلوچوں کی قوم پرستی کو نیک نیتی کے ساتھ اس سارے مسئلے میں شمار کیا جائے۔بلوچ انرجی کی ترقی میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں اس کے دشمن نہیں۔اس کے حوالے سے کوئی بھی حل خطرات سے بھرا ہوا ہے۔

حاصل بحث

اس بحث کا اختتام کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ بلوچ علیحدگی پسند تحریک جو
اس وقت چل رہی ہے وہ 1970ء میں جنم لینے والی تحریک سے بہت حد تک مختلف ہے
بالخصوص جب اس میں توانائی کے وسائل کی ترقی کے حوالے سے بات کی جاتی ہے
جس کے بارے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ توانائی کے حوالے سے ''نیا مشرق
وسطیٰ''(بشمول جنوب، وسطی اور جنوب مغربی ایشیا) ہے۔توانائی کے تناظر میں یہ
تبدیلی باغیوں کے لیے مواقع کے اعتبار سے سہ پہلو اثرات کی حامل ہے۔اول یہ کہ
اس سے بلوچستان اور بلوچ قوم پرستی کے معاملے کو اس سطح سے کہیں اوپر اٹھایا جاسکتا
ہے جو کہ اس وقت مرکزی حکومت کی ترجیحات کے حوالے سے ہے جس میں
بلوچستان کو اسی طرح دیکھا جاتا ہے جس طرح مرکزی حکومت دیکھنا چاہتی ہے یا زیرو
ٹالرینس اور کچل دینے کا رویہ وغیرہ۔دوئم ، اس کے ذریعے بلوچ باغیوں کو زیادہ
مراعات سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے کہ وہ بلوچستان پر کنٹرول حاصل کریں اور بغاوت
جاری رکھتے ہوئے مرکزی حکومت کے لیے سیاسی اور معاشی نقصان کا باعث

بنیں۔ سوئم، جو کہ زیادہ امید افزاء امکان ہے کہ بلوچستان میں توانائی کے ذرائع کے ذریعے صوبے کو اہم علاقہ بنایا جائے اور بلوچ قوم پرستوں کے وہ مطالبات پورے کیے جائیں جو مثبت اور سب کے لیے قابل قبول ہوں۔ حکومت کی بغاوت کے خلاف لڑائی کی حکمت عملی کی سفا کی و بے رحمی کے باوجود بلوچستان کا توانائی کے حوالے سے تیزی سے پھیلتا ہوا تناظران ذرائع اور مراعات کا باعث بن سکتا ہے جن کو کام میں لا کر بغاوت کو کامیابی اور ہمواری کے ساتھ ختم کیا جا سکے۔

پاکستانی حکومت کو اس بات پر قائل کرنا آسان نہ ہوگا کہ وہ بلوچستان میں اپنے طریقہ کار کو تبدیل کرے اور بلوچ قوم پرستوں کو لگے بندھے فوجی طاقت کے حربے کے بجائے سیاسی طور پر مصروف کرے۔ مسئلہ مبینہ فوجی طرز فکر کا نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ توانائی سے متعلقہ اور دیگر سٹرٹیجک طاقتیں جو اس خطے میں اثرات مرتب کر رہی ہیں وہ پاکستان کی پالیسی سازی کے عمل کو اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے متحد ہو چکی ہیں اور بعض مثالوں میں تو وہ آپشنز کو تنگ کر رہی ہیں اور کچھ مثالوں میں تو اسلام آباد کو ڈکٹیٹ کر رہی ہیں۔ بدقسمتی سے جیسا کہ جسٹن ڈن نے مشاہدہ پیش کیا ہے کہ یہ طاقتیں تو پاکستان کی مرکزی حکومت سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ بلوچستان میں اپنی حاکمیت کو سختی سے منوائے۔

1970ء کی دہائی کی طرح بلوچستان آج بھی افغانستان کے سائے میں کھڑا ہے جو پالیسی کے المیوں کے حوالے سے اسلام آباد کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا سبب ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی سائے ہیں جو تاریکی پھیلانے والے ہیں اور ان

میں ہر ایک کے اپنے اپنے تحفظات ہیں۔ اسلام آباد کے لیے اس حوالے سے پالیسی سازی میں کس قدر تحفظات درپیش ہو چکی ہیں۔ ان تحفظات میں نہ صرف اس کے اپنے توانائی کے ذرائع شامل ہیں بلکہ ایران اور ترکمانستان وغیرہ سے گیس کی مجوزہ درآمد اور چین کے اشتراک سے شمالی جنوبی تجارتی اور توانائی کے کوریڈور کا منصوبہ بھی شامل ہے۔ ایسا بہت غیر امکانی دکھائی دیتا ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ان تحفظات میں کسی قسم کی کمی ہوگی۔ نتیجتاً حکومت کو اس بات پر قائل کرنا کہ وہ بلوچ قبائلی اقلیت کے مطالبات کو بلند تر ترجیحات میں شامل کرے، بلاشبہ ایک مشکل امر ہوگا۔

تاہم اسلام آباد کو یہ سمجھنا ہوگا کہ بلوچ قوم پرستوں کے مطالبات کو جگہ دینا ان کو نظر انداز کرنے یا ختم کرنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر آپشن ہوگا۔ آخر صرف توانائی کے حوالے سے مسابقت ہی واحد مسئلہ نہیں جو بلوچستان کو درپیش ہے۔ جیسا کہ سٹیومیٹس کہتے ہیں کہ ہم عصر بغاوتیں اب زیادہ عمومی طور پر اپنے سٹریٹجک تناظر، سٹرکچر اور ڈائنامکس کے اعتبار سے بنیادی تبدیلیوں سے دوچار ہیں اور اب یہ پہلی بغاوتوں کے مقابلے میں خاصی مختلف ہیں۔ یہ تبدیلی اس چیز کی ضرورت کی عکاسی کرتی ہے کہ اب حکومتوں کو بغاوتوں سے نمٹنے کے لیے بھی تبدیل شدہ حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔ وہ کہتے ہیں کہ ان بغاوتوں سے اصل خطرہ یہ ہے کہ کہیں یہ ایک مستقل لڑائی کے اثرات نہ حاصل کر لیں۔ ہوسکتا ہے کہ سیاسی عدم استحکام اور دیگر کئی قسم کے تباہ کن مسائل بغاوتوں کو تباہ کرنے کی سوچ کا نتیجہ ہوں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ مسئلہ باغیوں کی فتح کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ لڑائی کی طوالت کا ہے۔

چنانچہ پاکستان کے رہنماؤں اور اس کے دوست ملک کے رہنماؤں کو فوری طور پر اپنی پالیسیوں پر نظرثانی کرنا چاہیے تاکہ بلوچستان کو مسئلے کو مزید طول پکڑنے سے روکا جاسکے۔اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بلوچ کو توانائی کے وسائل کی ترقی میں حصہ دار بنایا جائے، دشمن نہیں۔

حواشی

1۔ قبائل اور بلوچستان کے صوبے کو انگریزی میں ''یو'' کے ساتھ baluchistan اور baluch اور ''او'' کے ساتھ balochistan اور baloch دونوں طرح سے لکھا جاتا ہے لیکن موخر الذکر زیادہ زیر استعمال ہے۔

2۔ سیلگ جی ہیری سن ، ''ان دی شیڈو آف افغانستان'، بلوچ نیشنل ازم اینڈ سوویت ٹیمپٹیشنز'

3۔ سیاسی تنازعات کے حوالے سے بات ہو رہی ہو تو یقینی طور پر الفاظ بھی ہتھیار ہوتے ہیں۔ چنانچہ ''انسر جنسی'' کا مطلب ایک منظّم، وسیع اور مسلسل ریاست دشمن متشدد تحریک ہے۔ بلوچستان میں جاری لڑائی کو ''کم شدت کی انسر جنسی'' کہا جا سکتا ہے۔

4۔ فوجی حکمرانی کا آٹھ سالہ اور فوجی کیئریئر کا چھیالیس سالہ دور ختم کر کے مشرف نے آرمی چیف کا عہدہ چھوڑ دیا اور 2007ء میں سویلین صدر بن گئے۔

5۔ بھارتی صدر عبدالکلام نے 2007ء میں انرجی سیکورٹی کے حوالے سے خطاب

کرتے ہوئے کہا کہ انرجی کے حوالے سے خودمختاری ان کی قوم کی اولین اور اہم ترین ترجیح ہے۔

6۔ ہیری سن، صفحہ سات

7۔ بی رامن، سیکورٹی آف چائنیز نیشنلز ان پاکستان، انٹرنیشنل ٹیررازم مانیٹر، جلد 266

8۔ پاکستان کے توانائی کے وسائل کے بارے میں اعداد وشمار اور دیگر معلومات کے لیے دیکھیے، انرجی انفارمیشن ایڈمنسٹریشن، کنٹری انالسز بریف، پاکستان، www.eia.doe.gov

9۔ پٹرولیم اینڈ نیچرل ریسورسز ڈویژن، منسٹری آف پٹرولم اینڈ نیچرل ریسورسز، حکومت پاکستان، سوئی ناردرن گیس کمپنی لمیٹڈ، تعارف اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔www.pakistan.gov.pk/contentinfo.jsp

10۔ نوید احمد ''ٹربل ان پاکستان انرجی رچ بلوچستان''

11۔ طارق نیازی، ''بلوچ انسرجنٹس ایسکلیٹس اٹیکس ان پاکستان''

12۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ، پاکستان، دی ورسننگ کونفلکٹ ان بلوچستان

13۔ ایم ضیاءالدین، ''ایکسسینگ فاسل فیولز ان بلوچستان'' چار ستمبر 2006 ڈان اخبار

14۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ پی پی، 17-16

15۔ یہ اور اگلا حصہ مصنف کے کچھ پیپرز ''انڈیا ز لینتھنگ شیڈوز، دی یو ایس پاکستان سٹرٹیجک الائنس اینڈ دی وار ان افغانستان'' کا حامل ہے جو انہوں

نے 2007ء میں لندن میں ایک عالمی سیمینار میں میں پیش کیے تھے۔

16۔ بھارت کے بڑھتے ہوئے توانائی کے بحران کے بارے میں مصنف نے اپنے پیپرز بعنوان ''دی پراگرس آف ڈی ٹنٹ ان انڈیا پاکستان ریلیشنز، نیو چیپٹرز آر سٹرٹیجک شیرڈ'' میں لکھا تھا جو انہوں نے ایک بین الاقوامی سمپوزیم میں پیش کیے تھے۔

17۔ بھارت کا ممکنہ گیس کا خسارہ اب تک بلند ترین سطح پر پہنچ چکا ہے۔ سدھارتھ سری واستو' انڈیا، آئیز ملٹری فیورز فار میانمار آئل''

18۔ آئی پی آئی گیس پرائس فارمولا پر اتفاق، ایشین ایج، سولہ جولائی 2007

19۔ سدھارتھ سری واستو، '' ایگزٹ ایران ز آئل منسٹر اینڈ اے پائپ لائن ٹو'' ایشیا ٹائمز، آن لائن 2007

20۔ گذشتہ جنوری 2007ء تک ایران پابندیاں ایکٹ یا اس سے پیشتر ایران لیبیا پابندیاں ایکٹ کے ذیل میں کسی کمپنی میں پابندی عائد نہیں کی گئیں۔

21۔ ماؤرا رینالڈز ''یو ایس انڈیا ریچ نیوکلیئر ایکارڈ''، لاس اینجلس ٹائمز اٹھائیس جولائی 2007

22۔ ہمیں پائپ لائن روکنے کی ضرورت ہے، بوڈ مین کا کہنا تھا، دی ہندو، تیئس مارچ 2007

23۔ ونیش کٹھوریہ، ''سرحد پار گیس پائپ لائن کا وعدہ'' دی ہندو آٹھ مارچ 2006

24۔ ''ٹف بٹ ورک ایبل آپشنز'' تہلکہ ڈاٹ کام، اٹھائیس جولائی 2007

25۔ مثال کے طور پر دیکھیے، جان ڈیلی کی تصنیف، ''بلوچ بغاوت اور پاکستانی

انرجی سیکٹر کو اس سے لاحق خطرات'' ٹیررازم فوکس، جلد تین شمارہ گیارہ، اکیس مارچ 2006

26۔ کٹھوریہ

27۔ ایڈیٹوریل، ''ہاؤ رئیلیسٹک اس ٹی اے پی گیس پائپ لائن'' ڈیلی ٹائمز، اگست 2007

28۔ پاکستان میں توانائی کے بحران کی سطح ہر لحاظ سے خطرناک ہے۔ اس سلسلے میں خلیق کیانی کی ڈان اخبار کے آٹھ جنوری 2007 کے شمارے میں رپورٹ دیکھیں۔

29۔ گوادر پورٹ کے افتتاح کے موقع پر صدر مشرف کی تقریر کے لیے دیکھیں،
www.presidentofpakistan.gov.pk

30۔ مصنف نے اسلام آباد میں مارچ 2007ء میں انٹرویو کیا، درخواست پر نام نہیں دیا گیا۔

31۔ طارق نیازی، ''گوادر، چین کی بحر ہند میں بحری چوکی''، ایسوسی ایشن فار ایشین ریسرچ 2005

32۔ دیکھیے سید فضل حیدر کی رپورٹ ''چائنہ رائزز ٹو پاکستان ز ڈیفنس'' ایشیا ٹائمز آن لائن جولائی 2007

33۔ ایم کے بھدر کمار کی رپورٹ ''افغان برج ایکسپوز ز ہیوج ڈیوائیڈ''، ایشیا ٹائمز آن لائن 2007

34۔ دوشنبے تاجکستان میں امریکہ کی ایمبیسی کی پریس ریلیز،

35۔ تاہم پاکستان افغان اشیاء کے بھارت کو زمینی راستہ دینے سے انکار نہیں کرتا۔

36۔ فریڈرک گریر، پاکستان، دی ری سرجنس آف بلوچ نیشنل ازم، کارنیگی پیپرز 65

37۔ بی رامن کی رپورٹ، ''بلوچ شیڈ واوورون جیاباؤوزٹ''، ساؤتھ ایشیا انیلسز گروپ پیپر 1339

38۔ مصنف نے جنوری 2007ء میں انٹرویو کیا۔

39۔ ہیری سن کی کتاب جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا، بلوچ تاریخ اور بلوچ قوم پرستی کے ارتقاء کے بارے میں شاندار معلومات فراہم کرتی ہے۔

40۔ قیصر بنگالی اور ماہ پارہ صداقت ''ریجنل اکاؤنٹ آف پاکستان، میتھا ڈولوجی اینڈ ایسٹیمیٹس 2000-1973'' کراچی سوشل پالیسی اینڈ ڈویلپمنٹ سنٹر 2006

41۔ پرویز طاہر، ''پرابلمز اینڈ پولیٹکس آف فسکل فیڈرل ازم ان پاکستان''

42۔ سینٹ آف پاکستان، بلوچستان کے بارے میں پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ

43۔ طاہر، صفحہ 76

طط، مردم شماری کے مکمل اعداد و شمار انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔

45۔ سینٹ آف پاکستان،

46۔ لارا کنگ، ''بیٹل ریجنگ ان ریموٹسٹ پاکستان''، لاس اینجلس ٹائمز، اگست 2007

47۔ تیمور شاہ اور کارلوٹا گال ''افغانستان کے باغیوں کو پاکستان میں جنت مل گئی، مشرف'' دی نیویارک ٹائمز بارہ اگست 2007

48۔ اس مسئلے پر دیکھیے سکاٹ بالڈاف کی تحریر'انڈیا پاکستان رائلوری ریچز ان ٹو افغانستان''، کرسچن سائنس مانیٹر، بارہ ستمبر 2003،اور دیگر تحریریں

49۔ بی رامن، ''گوادر، بلوچز بلاسٹ ڈیل ود سنگاپور کمپنی' ساؤتھ ایشیا اینلسز گروپ پیپر 2127

50۔ طارق سعیدی ''پاکستان، ان ویلنگ دی مسٹری آف بلوچستان انسرجنسی'' انٹیلی بریف، مارچ 2005

51۔ اس سلسلے میں سیلگ جی ہیری سن پاکستان کے ان ہتھکنڈوں کے بارے میں لکھتے ہیں جو وہ بلوچ قوم پرستوں کی بغاوت کی تحریک کے خلاف اپنا رہا ہے۔ایک مضمون میں وہ اسے ''سلوموشن قتل عام'' کہتا ہے جو کہ بلوچوں کے خلاف برپا ہے۔اگست 2006 ہزاروں بلوچوں کو ایف سولہ اور کوبرا ہیلی کاپٹروں کے ذریعے کی جانے والی بمباری سے بچنے کے لیے ان کے گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ہیری سن کا کہنا ہے کہ پاکستان کے صدر مشرف اپنے پیش رووں کے مقابلے میں بلوچ باغیوں کے خلاف نئے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے جو پہلے سے زیادہ جابرانہ ہیں۔بلوچ ترجمان بڑے پیمانے پر بلوچ کے اغوا اور انہیں لاپتہ کیے جانے کا الزام عائد کرتے ہیں اور یہ کہ پاکستانی فورسز نامعلوم الزامات لگا کر بلوچ نوجوانوں کو اغوا کرتی ہیں اور انہیں نامعلوم مقام پر لے جاتی ہیں۔

52۔ بلوچستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے بارے میں کئی چشم کشا رپورٹیں موجود ہیں۔ دیکھیے انصار برنی ٹرسٹ کی بلوچستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے رپورٹ 2006

53۔ اس حصے کا زیادہ تر مواد مصنف کی جانب سے کیے جانے والے انٹرویو کا نتیجہ ہے

54۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ، دی ورسنگ کونفلکٹ ان بلوچستان

55۔ ہیری سن، ''پاکستان ز بلوچ انسرجنسی''

56۔ سرداروں بالخصوص اکبر بگٹی کے اذیت پسند رویوں کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ حکومت کے حامی ایک رسالے میں ایسی تصاویر شائع کی گئیں جن میں سرداروں کے تشدد کے شکار افراد کو دکھایا گیا۔ اس کے علاوہ وہ بھاری ہتھیار بھی دکھائے گئے جو انہوں نے حکومت سے لڑنے کے لیے جمع کیے ہوئے تھے۔ ٹیررازم ان بلوچستان اینڈ گورنمنٹ رسپانس، کوئٹہ (تاریخیں اور دیگر معلومات موجود نہیں)

57۔ پاکستانی حکومت کی جانب سے بلوچ سرداروں کے خلاف پروپگنڈا کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ اس بغاوت کی تاریخ، ستر کی دہائی میں بلوچ سرداروں کے کارٹون بنائے جاتے تھے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ایک کارٹون میں ایک تلوار جسے ذوالفقار (ذوالفقار بھٹو، تلوار کو عربی میں ذوالفقار کہتے ہیں) کا نام دیا گیا تھا کے ذریعے بلوچ سرداری نظام کے ظالمانہ ہاتھوں کو کاٹتے دکھایا گیا تھا۔

58۔ مصنف نے 2007 میں راولپنڈی میں انٹرویو کیا۔

59۔ دیکھیے انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی رپورٹ ، ورسنگ کونفلکٹ ان بلوچستان،

60۔ اسماعیل خان کی رپورٹ، اویس نے بلوچستان کا گورنر نامزد ہونے کی تصدیق کردی۔ ڈان اخبار 2003

61۔ سید سلیم شہزاد، بلوچستان ٹرائبس تھریٹن پاکستان گیس رچز، ایشیا ٹائمز آن لائن 2002ء

62۔ یہ ایک ایسی پیش رفت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کو بلوچ باغیوں سے نمٹنے میں مشکل کا سامنا ہے۔

63۔ سلیم شہزاد،، بلوچستان ٹرائبس تھریٹن پاکستان گیس رچز، ایشیا ٹائمز آن لائن 2002ء

64۔ پراوین سوامی، بلوچستان شیڈ واو وراِنڈیا پاکستان ٹائز، دی ہندو، مارچ 2006

65۔ پاکستان، دی ڈیتھ آف ریبل لیڈر، سٹرٹیجک فورسی انگ، 2006

66۔ ملک سراج اکبر، ''ٹیکنگ آن دی سٹیٹ''، فرنٹ لائن، جلد 24 شمارہ، چار

67۔ سلیم شہزاد، بالاچ مری ہلاک کر دیے گئے ، کوئٹہ میں تشدد، سکول بند، ڈان اخبار، 2007

68۔ رحیم اللہ یوسف زئی، ''مینگل کے خلاف مقدمہ''، دی نیوز، 2007ء

69۔ سینٹ آف پاکستان

70۔ صفحہ پچانوے تا ایک سو ایک

71۔ صفحہ سو

72۔ مصنف نے انٹرویو کیا

73۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی رپورٹ